سلسلۂ آسان کتب

اسرار و رموز

محمد اقبال

مدیر: خرم علی شفیق

تلخیص و ترجمہ: مزمّلہ شفیق

تصاویر: تبسم خالد

اقبال اکادمی پاکستان

اسرار و رموز

مدیر

خرم علی شفیق

تلخیص و ترجمہ

مزمّلہ شفیق

تصاویر

تبسم خالد

اقبال اکادمی پاکستان

جملہ حقوق محفوظ

ناشر

محمد سہیل عمر

ناظم

اقبال اکادمی پاکستان

حکومتِ پاکستان، وزارت ثقافت

چھٹی منزل، ایوانِ اقبال، لاہور

Tel: [+92-42] 99203573, 36314510, 99203906

Fax: [+92-42] 36314496

Email: info@iap.gov.pk

Website: www.allamaiqbal.com

ISBN 978-969-416-450-2

طبع اوّل : ۲۰۱۰ء

تعداد : ۲۰۰۰

قیمت : ۲۰۰ روپے

مطبع : دارالفکر، لاہور

اسرار و رموز کیسے لکھی گئی؟

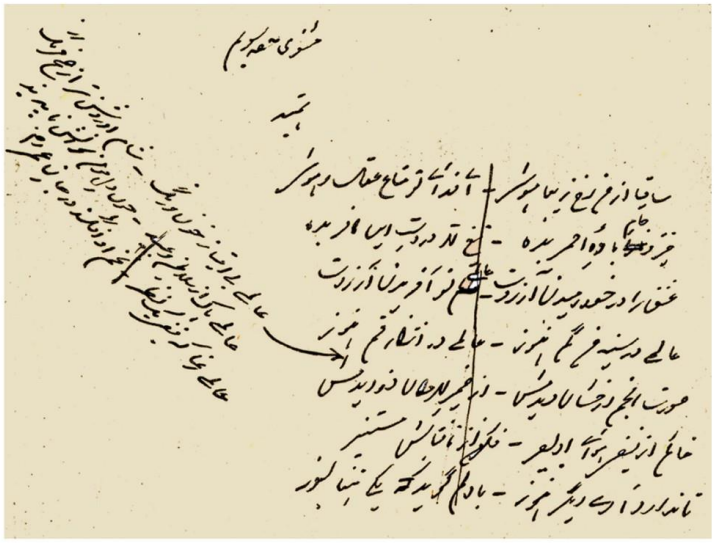

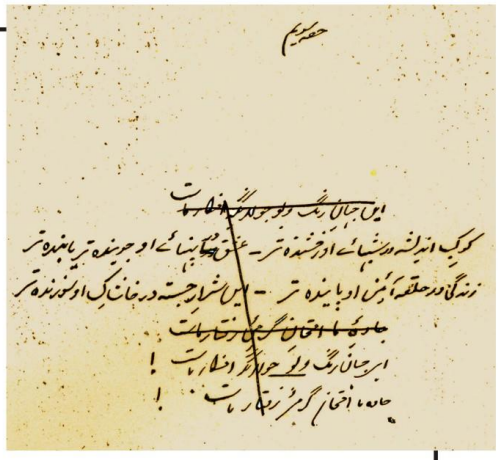

۱۹۰۷ء میں اقبال یورپ میں تھے جب انھیں محسوس ہوا کہ وہ جن سوالات کے جواب کی تلاش میں تھے وہ اُنھیں مل گئے ہیں۔ یہ قرآن شریف کے بعض ایسے پہلو تھے جو پہلے کبھی بیان نہیں ہوئے تھے اور ان کا تعلق اقوام کی زندگی اور دنیا کے مستقبل سے تھا۔

اُس وقت اقبال کی عمر تیس برس تھی۔ وہ اپنی بات اِس انداز سے کہنا چاہتے تھے کہ کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو اور پیغام ٹھیک طرح سے لوگوں تک پہنچ جائے۔ قدرت نے اُنھیں شاعری کی صلاحیت عطا کی تھی جو اس مقصد کے لیے انتہائی مفید ہو سکتی تھی۔ پچھلے سات آٹھ برس میں وہ اُردو زبان کے مشہور ترین شعراء میں شامل ہو چکے تھے مگر اب شاعری میں ایک ایسے انداز کی تلاش تھی جو اُن باتوں کے لیے مناسب ہو جو دل میں آ رہی تھیں۔

اِس کوشش میں چھ برس گزر گئے۔ ایک رات اقبال نے خواب میں دیکھا کہ مولانا جلال الدین رومی جو فارسی کے بہت بڑے شاعر، مفکر اور عظیم صوفی بزرگ ہو گزرے ہیں، خواب میں اُن سے کہہ رہے ہیں کہ مثنوی لکھیں۔ اگلی صبح اقبال بیدار ہوئے تو اُن کی زبان پر اُردو کی بجائے فارسی اشعار جاری تھے اور یہ ایک نئی مثنوی تھی۔ اقبال کے دوست خواجہ حسن نظامی جو کچھ عرصہ پہلے انھیں

''اسرارِ خودی'' اور ''رموزِ بیخودی''، مکمل کرنے کے بعد علامہ اقبال نے کم سے کم دو دفعہ مثنوی کا تیسرا حصہ شروع کرنے کی کوشش کی لیکن بالآخر وہ عارفانہ غزلوں کی طرف نکل گئے۔ بیاض کے دو صفحے جو یہاں دکھائی دے رہے ہیں، وہ ترک کر دیے گئے جبکہ ان کے بعد کے صفحات پر لکھے ہوئے اشعار ''زبورِ عجم'' (۱۹۲۷) میں شامل کر لیے گئے۔

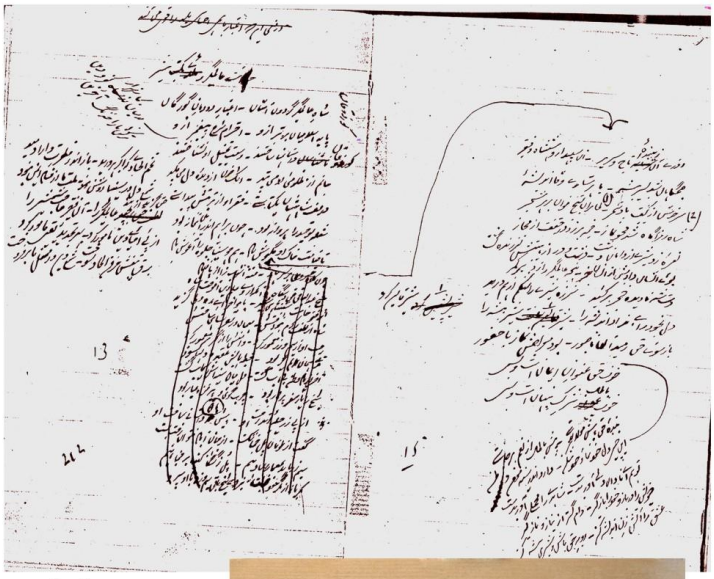

''ترجمانِ حقیقت'' کا لقب دے چکے تھے انھوں نے اِس نئی نظم کا نام ''اسرارِ خودی'' تجویز کیا۔ یہ ۱۹۱۵ء میں شائع ہوگئی مگر چونکہ اقبال نے فارسی کے ایک اور بزرگ شاعر حافظؔ شیرازی پر تنقید کی تھی کہ اُن کی شاعری پڑھنے والوں کو عملی زندگی سے دُور لے جاتی ہے لہٰذا بہت سے لوگ خلاف ہو گئے جن میں خواجہ حسن نظامی بھی شامل تھے۔ دو تین برس بعد اقبال نے حافظؔ پر اعتراضات واپس لے لیے اور دُوسری اشاعت سے وہ اشعار نکال دیے تو یہ مخالفت بھی ختم ہوگئی۔

دراصل اقبال سمجھتے تھے کہ قوموں کی زندگی میں مختلف اَدوار آتے رہتے ہیں۔ زوال کا وقت ہو تو مایوسی کے ادب سے گریز کرنا چاہیے مگر اَب مسلمان بیدار ہو رہے تھے اِس لیے حافظؔ کی مخالفت کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی چنانچہ بعد کی کتابوں میں اقبال نے حافظؔ کی تعریف بھی کی۔

اِس دوران میں اقبال نے مثنوی کا دُوسرا حصہ ''رموزِ بیخودی'' کے عنوان سے لکھ کر ۱۹۱۸ء میں شائع کروا دیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد دونوں حصے یکجا اسرار و رموز کے نام سے شائع ہوئے۔ یہی اقبال کی شاعری کی پہلی کتاب ہے کیونکہ اس سے پہلے جو اُردو نظمیں انھوں نے لکھی تھیں وہ کبھی کتابی صورت میں شائع نہیں کروائی تھیں۔ انھیں اقبال نے بعد میں بانگِ درا کے نام سے کتابی صورت میں یکجا کیا کتابوں کی ترتیب میں اسرار و رموز سب سے پہلے آتی ہے۔

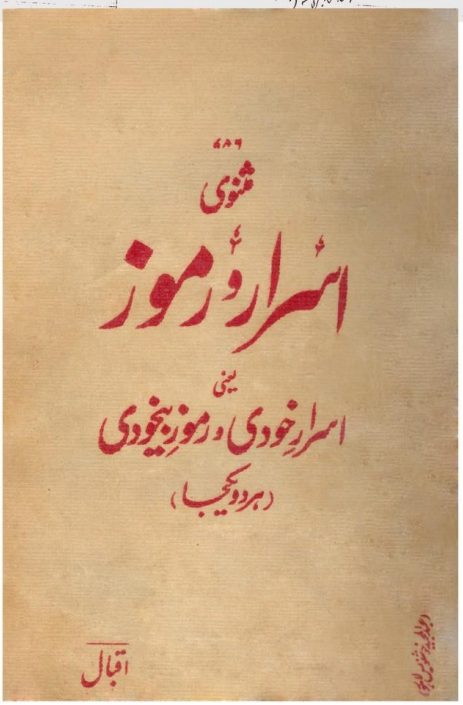

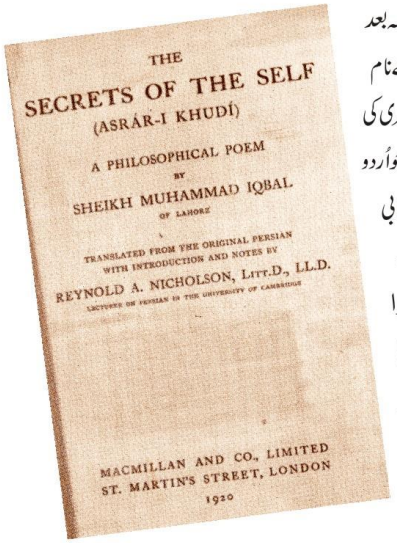

THE
SECRETS OF THE SELF
(ASRÁR-I KHUDÍ)
A PHILOSOPHICAL POEM
BY
SHEIKH MUHAMMAD IQBAL
OF LAHORE

TRANSLATED FROM THE ORIGINAL PERSIAN
WITH INTRODUCTION AND NOTES BY
REYNOLD A. NICHOLSON, LITT.D., LL.D.
LECTURER ON PERSIAN IN THE UNIVERSITY OF CAMBRIDGE

MACMILLAN AND CO., LIMITED
ST. MARTIN'S STREET, LONDON
1920

فہرس

اسرارِ خودی

خودی	۶
آرزو	۸
عشق	۸
قوت اور کمزوری	۱۰
ادب اور افکار	۱۱
خودی کی تربیت	۱۴
ایک نوجوان اور علی ہجویری	۱۵
معاشرے میں رہنا	۱۶
وقت تلوار ہے	۲۰
دعا	۲۱

رموزِ بیخودی

انتساب	۲۲
تمہید: فرد اور معاشرہ	۲۳
توحید	۲۴
رسالت	۲۵
زمان و مکان	۲۸
قرآن	۲۹
قومی زندگی	۳۰
امومت	۳۲
خلاصہ	۳۳
عرضِ حال	۳۴

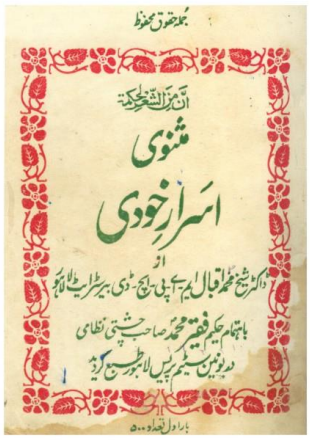

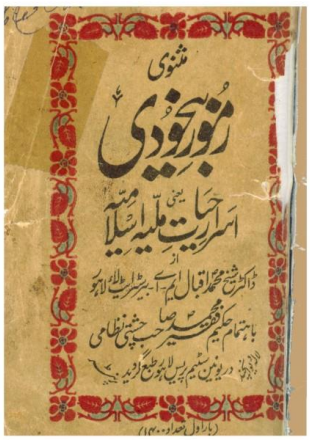

اسرارِ خودی

کل شیخ چراغ لے کر شہر کے گرد چکر لگا رہا تھا کہ بھوت پریت اور جانوروں سے تنگ آ چکا ہوں، مجھے انسان کی آرزو ہے۔ ان ناکارہ اور گرتے پڑتے ہمراہیوں سے مایوس ہوں، مجھے شیرِ خدا اور رستم کی آرزو ہے!

میں نے کہا وہ نہیں ملتا، ہم بہت ڈھونڈ چکے ہیں۔ اُس نے کہا، جو نہیں ملتا مجھے اُسی کی آرزو ہے!

(رُومیؔ)

صبح ہوئی تو میرے آنسوؤں نے گلاب کا چہرہ دھو ڈالا اور نرگس کی آنکھوں سے نیند کا اثر ختم کر دیا۔ میری آواز کی گرمی سے سبزہ بیدار ہو کر زمین سے نکل آیا، باغبان نے میرے کلام کے زور کو آزمایا اور میرے شعروں کو مٹی میں بو کر تلواروں کی فصل کاٹی۔

میں ایسی چیزوں سے بھی باخبر ہوں جو ابھی دنیا میں پیدا نہیں ہوئیں۔ میں مستقبل کا شاعر ہوں۔ میرا دور راز نہیں جانتا اور اپنے پرانے ساتھیوں سے مایوس ہو کر میں ان کی طرف دیکھ رہا ہوں جو میرے بعد آئیں گے۔ بے شک بہت سے شاعر اپنی موت کے بعد پیدا ہوئے اور انھوں نے ہماری آنکھیں تب کھولیں جب ان کی اپنی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ وہ پھول کی طرح اپنے مزاروں کی خاک سے نمودار ہوتے ہیں۔

اے ساقی! میرے فکر کی تاریک رات میں چاندنی بکھیر دے تاکہ میں بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھاؤں اور آواز کی طرح دنیا کی ساعت میں گم ہو کر اپنی شاعری کی وقعت کو بڑھا دوں۔

میرے مرشد رومی ہیں، جنھوں نے میری خاک کو کندن بنا دیا۔ میں انسانیت کے دکھوں اور مشکلات پر آہ وزاری کرتے کرتے سو گیا تو ایک رات وہ میرے خواب میں آئے۔ ''عشق کی خالص شراب کا ایک گھونٹ پیو،'' اُنہوں نے مجھ سے کہا۔ ''تم آخر کب تک ایک کلی کی طرح خاموش رہو گے؟ اپنی خوشبو کو گلاب کی طرح دور دور تک پھیلنے دو۔ قدیم مے فروش کے رازوں کو کھول کر بیان کر دو، سر کو پرانے جنوں سے خالی کر کے نئے راستے پر قدم رکھ دو۔ اے رحیلِ کارواں! اٹھو!''

اِن الفاظ پر میں اِس طرح اُٹھا جیسے تار میں سے نغمہ برآمد ہوتا ہے اور میں نے ساعت کے لیے ایک ایسی جنت سجا دی جہاں میں خودی کے رازوں سے پردہ اٹھا سکوں۔

خودی

خودی ہی زندگی کو صورت عطا کرتی ہے۔ جو کچھ تم دیکھتے ہو وہ خودی کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔ جب خودی نے خود کو بیدار کیا تو فکر و شعور کی دنیا ظاہر ہوئی۔ اپنے جوہر میں سیکڑوں دنیائیں رکھتے ہوئے اس نے اپنے وجود کے اثبات کے لیے اپنی ضد کو جنم دیا اور اُسے غیر سمجھتے ہوئے دنیا میں کشمکش کا بیج بویا۔

خودی کے قلم نے سیکڑوں ''آج'' تخلیق کیے تا کہ ایک ''کل'' کی صبح کو حاصل کر سکے۔ اس کی دل فریبیاں ہی زندگی کی اصل ہیں۔ یہ قتل کرتی ہے تا کہ اپنے بازو کی قوت کا اندازہ کر سکے، اور اسی بنانے اور مٹانے کے عمل سے یہ روحانی حسن کو تخلیق کرتی ہے اور اس کی تکمیل کرتی ہے۔ ایک گلاب کی خاطر سیکڑوں باغ فنا ہو جاتے ہیں اور ایک آسمان کی سجاوٹ کے لیے سیکڑوں نئے چاند طلوع ہوتے ہیں۔ فرہاد نے کوہِ بے ستوں کھود ڈالا یہاں تک کہ بنجر چٹانوں سے دودھ کی نہر پھوٹ پڑی مگر یہ محنت بے سود نہ تھی، شیریں کا حسن اس کا ایک معقول جواز ٹھہرا۔

اپنا اظہار خودی کو مرغوب ہے۔ علّت اور معلول کا سلسلہ بھی خودی کی تخلیق ہے تا کہ دنیا میں عمل کو ممکن بنایا جا سکے اور زمانے کی وسعت اس کے عمل کا میدان ہے۔ خودی اٹھتی ہے، روشن کرتی ہے، گرتی ہے، جلتی ہے، زندہ ہوتی ہے، جلاتی ہے، چمکتی ہے، بھاگتی ہے اور اڑتی ہے، یہاں تک کہ یہ خود کو بکھیر کر خاک کر دیتی ہے۔

ہر ذرّے کی زندگی کا درجہ اس کی خودی کے استحکام کے مطابق ہے کیونکہ اس کائنات میں ہر چیز کی زندگی کا دارومدار اسی قوت پر ہے۔ جب پانی کا ایک قطرہ اس قوت کو پالیتا ہے تو خود کو ایک قیمتی موتی بنالیتا ہے اور جب ایک پہاڑ اپنی خودی کھو دیتا ہے تو خاک میں تبدیل ہو جاتا ہے جسے سمندر کی پُر جوش لہریں بہالے جاتی ہیں۔ موج جب تک موج بن کر رہتی ہے وہ سمندر کے کندھوں پر سوار رہتی ہے اور سبزہ جب اپنے اندر اُگنے کی قوت پاتا ہے تو باغ کا سینہ چاک کر دیتا ہے۔ چونکہ زمین اپنی ہستی پر مضبوطی سے قائم ہے اس لیے چاند اس کے گرد طواف کا پابند ہے اور چونکہ سورج مضبوط تر ہے لہٰذا زمین اُس کے سحر میں گرفتار ہے۔

جب زندگی خودی سے قوت حاصل کرتی ہے تو زندگی کا دریا وسیع ہو کر سمندر بن جاتا ہے۔

آرزو

آرزو ہی زندگی کا اصل ہے اور اِسی سے زندگی کو بقا حاصل ہوتی ہے۔ یہ دنیا کی روح ہے اور ہر چیز کی فطرت میں شامل ہے۔ کبوتر نے وقار سے چلنے کی خواہش کی تو اُسے پاؤں حاصل ہوئے اور بلبل نے گانے کی کوشش کی تو چونچ مل گئی۔ ہمیں دیکھنے میں لذت محسوس ہوئی تو اسی لذت نے آنکھ کی صورت اختیار کر لی۔

آرزو ہی دل کو رقص پر آمادہ کرتی ہے اور سینے کو آئینے میں تبدیل کر دیتی ہے۔ آرزو کا خاتمہ زندہ وجود کے لیے موت ہے، جس طرح گرمی ختم ہونے سے شعلہ بجھ جاتا ہے۔ معاشرتی ادارے، رسومات، قوانین اور سائنس کے کرشمے، یہ سب آرزو ہی کی مجسّم شکلیں ہیں جب وہ لوگوں کے دلوں سے پھوٹتی ہے اور ایک واضح شکل اختیار کر لیتی ہے۔ سرکنڈے کے لیے اپنے جھنڈ سے جدا ہونا بہتر ثابت ہوا کیونکہ اس طرح وہ ایک بانسری میں تبدیل ہو گیا اور اس کا نغمہ سنا گیا!

اٹھو! اپنے لیے ایک مقصد تخلیق کرو اور زندگی کے رازوں سے باخبر ہو جاؤ۔

عشق

عشق خودی میں پوشیدہ صلاحیتوں کی پرورش کرتا ہے، اُسے دنیا کو جگمگا دینے کا طریقہ سکھاتا ہے اور اُسے زیادہ زندہ، زیادہ جلتا ہوا، زیادہ چمکدار اور زیادہ پائندہ بنا دیتا ہے۔

عشق اپنی فطرت میں بے خوف ہے اور اس دنیا کی پابندیوں سے آزاد ہے کیونکہ یہ اس دنیا سے تعلق نہیں رکھتا۔ یہ سخت ترین چٹانوں کو بھی توڑ دیتا ہے کیونکہ یہ زندگی کا سرچشمہ ہے اور موت کی چمکتی ہوئی تلوار ہے۔ یہ انسان کو بہتری کی طرف لے جاتا ہے۔ خدا کا عشق بالآخر سراپا خدا بن جاتا ہے۔ چنانچہ تم بھی ایک محبوب ڈھونڈو اور عشق کرنا سیکھو۔ نوحؑ جیسی نظر تلاش کرو اور ایوبؑ جیسا دل۔ ایک کامل استاد تلاش کر کے اپنی خاک کو کندن میں تبدیل کر لو۔ رومی کی طرح ایک شمع روشن کر کے اپنے اندر کے شہر کو اپنے مرشد کی آگ میں جلا دو تا کہ اُس کی راکھ سے ایک نئی دنیا پیدا ہو سکے۔

تمہارے دل میں ایک ایسا محبوب چھپا ہے جس کے چاہنے والے حسینوں سے زیادہ حسین، پیارے، خوش وضع اور محبوب ہو جاتے ہیں۔ عرب کی مٹی نے اُس کے فیض سے زندگی پائی اور اپنا مرتبہ آسمانوں تک بلند کر لیا۔ محمد مصطفیٰؐ، جو ہر مسلمان کے دل میں رہتے ہیں، ہماری آبرو آپؐ ہی سے ہے اور ابد آپؐ کے وقت کے ایک لمحہ سے بھی کم تر ہے۔ آپؐ بوریے پر سوتے تھے مگر کسریٰ کا تاج آپؐ کی امت کے قدموں تلے تھا۔ آپؐ نے غارِ حرا کی رات میں تنہائی

اختیار کی اور ایک ریاست، قوانین اور نظامِ حکومت قائم کیا۔ آپؐ کی نظر میں امیر اور غریب برابر تھے۔ آپؐ نے قدیم سلطنتوں کا خاتمہ کیا اور ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ آپؐ نے دین کی چابی سے دنیا کا دروازہ کھولا۔

ہم، جو آپؐ کے ماننے والے ہیں، آج اس دنیا میں مفلس اور محتاج ہیں اور آپؐ سے مہربانی کے طلبگار ہیں۔ حاتم طائی جو مہمان نوازی میں مشہور تھا، جب اُس کی بیٹی ایک جنگ میں قیدی بنا کر اس حالت میں آپؐ کے سامنے لائی گئی کہ اُس کے پاؤں زنجیروں میں جکڑے ہوئے، چہرہ بے نقاب اور گردن شرم سے جھکی ہوئی تھی تو آپؐ نے اُس کا سر اپنی چادر سے ڈھک دیا۔ ہمیں آپؐ کی مدد پر بھروسا ہے، نہ صرف روزِ قیامت بلکہ اس دنیا میں بھی۔

آپؐ کی محبت نے ہمیں علاقائی حد بندیوں سے آزاد کر دیا ہے کیونکہ آپؐ نے نسلی امتیاز کا خاتمہ کر دیا تھا۔ ہمارا تعلق عرب، چین اور ایران سے ایک جیسا ہے۔ ہم نگاہ کی مانند ہیں جو دو آنکھوں کے نور سے بنتی ہے مگر ایک ہوتی ہے۔ ہم گلاب کی طرح ہیں جس کی بے شمار پنکھڑیاں ہوتی ہیں مگر خوشبو ایک ہوتی ہے کیونکہ ہم ہی وہ راز ہیں جو آپؐ کے دل میں پوشیدہ تھا اور آپؐ ہمارے معاشرے کی روح ہیں۔

اپنے آپ کو اس محبوب کے لیے وقف کر دو، تھوڑی دیر کے لیے اپنے دل کے غارِ حرا میں تنہائی اختیار کرو، اپنی خودی سے جدا ہو کر خدا کی طرف پرواز کرو۔ پھر خدا سے قوت لے کر اپنی خودی کی طرف واپس آؤ اور ہوس کے بتوں کو توڑ دو تا کہ ربِّ کعبہ تمہیں زمین پر اپنا نائب بنا دے۔

تم کمزور ہو کیونکہ محتاج ہو۔ اِس روگ نے تم سے تمہارا بلند تخیل چھین لیا ہے، ورنہ تم زندگی کے پیمانے سے رنگین شراب کا ایک گھونٹ لے سکتے ہو اور زمانے کی جیب سے اپنی نقدی نکال سکتے ہو کہ تمہیں دنیا میں کبھی کسی کا احسان مند نہ ہونا پڑے۔

دوسروں کا احسان اٹھانے سے بچو! جب حضرت عمر فاروقؓ کے ہاتھ سے چابک گر گیا اور وہ اونٹ پر سوار تھے تو انھوں نے اونٹ سے اتر کر اسے خود اٹھانے پر اصرار کیا۔ اُنہوں نے اتنا چھوٹا سا احسان لینا بھی گوارا نہ کیا کہ کوئی ان کا چابک اُٹھا کر انہیں واپس کرے۔ ایسی فطرت جس کی نظر آسمانوں پر ہو، دوسروں کا احسان اٹھانے سے پست ہو جاتی ہے اور سوال کرنے سے مفلسی مزید ذلت سے دوچار ہو جاتی ہے۔

اپنی مٹھی بھر خاک کو بکھرنے نہ دو۔ جس طرح عشق خودی کو مضبوط تر بنا دیتا ہے، سوال اسے ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔

قوت اور کمزوری

خودی جب عشق سے قوت حاصل کر لے تو پھر وہ دنیا پر حکومت کرتی ہے۔

بوعلی قلندر جو پانی پت کے ایک مشہور بزرگ گزرے ہیں، اُن کا ایک مرید ایک دن بازار سے گزر رہا تھا۔ شہر کے حاکم کی سواری بھی ادھر سے گزری جس کے ساتھ کئی غلام اور چوبدار تھے۔ اُن میں سے ایک نے اُس درویش کو آواز دی کہ وہ راستے سے ہٹ جائے، مگر وہ بوعلی کے افکار میں مست تھا اس لیے توجہ نہ دے سکا اور اُسی طرح سر جھکائے اپنی سوچ کے سمندر میں غرق چلتا رہا۔ اُس بدلحاظ چوبدار نے اپنی لاٹھی درویش کے سر پر دے ماری۔ وہ تکلیف کے مارے ایک طرف ہو گیا اور دُکھی دل کے ساتھ بوعلی کے پاس چلا گیا۔ بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اس نے اُن سے فریاد کی۔ قلندر کی روح سے ایک اور ہی طرح کی آگ برآمد ہوئی اور اُنہوں نے شعلہ بار الفاظ میں سلطان علاء الدین خلجی کے نام ایک خط لکھوایا جو اُس وقت ہندوستان پر حکومت کر رہا تھا۔

''تمہارے آدمی نے میرے مرید کا سر پھاڑ دیا ہے اور اپنی زندگی میں جلتے ہوئے کوئلے جھونک دیے ہیں۔ اُس ظالم کو گرفتار کرو، ورنہ میں تمہاری سلطنت کسی اور کو بخش دوں گا!'' قلندر کے خدمت گار نے اپنا قلم اٹھایا اور یہ فرمان لکھ دیا۔ خط پڑھتے ہی بادشاہ کا رُواں رُواں کانپ اٹھا۔ اُس نے اُسی وقت حاکم کی گرفتاری کا حکم جاری کیا اور دہلی کے شیریں زبان شاعر امیر خسرو سے درخواست کی کہ وہ اُس کے سفیر بن کر جائیں اور قلندر سے اُس غلطی کی معافی دلوائیں۔ خسرو کے نغمے خود زندگی کے اَسرار سے پھوٹتے تھے۔ جب وہ قلندر کے سامنے حاضر ہوئے تو اُن کے ساز سے نغمے پیدا ہوئے اور درویش کا حجرہ اُن کے تخیل کی نرم چاندنی سے بھر گیا۔ بوعلی کی روح شیشے کی مانند پگھل گئی اور اُنہوں نے ایک نغمے کے عوض وہ سلطنت بحال کر دی جس کی بنیادیں پہاڑ جیسی مضبوط تھیں۔

اِس کے برعکس، خودی کی نفی کرنا وہ نظریہ ہے جو دنیا میں محکوم قوموں نے ایجاد کیا تا کہ اپنے حکمرانوں کے کردار سے قوت کو نچوڑ کر انہیں کمزور بنا سکیں۔ کیا تم نے اُن بھیڑوں کی کہانی سنی ہے جن کی چراگاہ پر ایک شیر نے قبضہ کر لیا تھا؟ شیروں سے چھٹکارے کی کوئی راہ نہ پا کر ان میں سے ایک بھیڑ نے شیر سے کہا:

''تمہارے دانتوں کی تیزی تمہیں رسوا کرتی ہے اور تمہاری سمجھ کو کمزور کرتی ہے۔ جنت تو صرف کمزوروں کے لیے ہے اور طاقت جہنم کا دروازہ ہے۔ دنیا ایک دھوکہ ہے۔ چنانچہ ایک واہمے کی خاطر خود کو مشکل میں نہ ڈالو! اپنی آنکھیں، کان اور ہونٹ بند کرو تا کہ تمہاری فکر آسمانوں کی بلندی کو پہنچ سکے! زندگی خودی کو مٹا دینے سے پختہ ہوتی ہے اور نیکوں کی جان چارے سے غذا حاصل کرتی ہے۔''

بھیڑ نے خود کو خدا کا نبی قرار دیا اور شیر جو سخت جدوجہد سے تھک چکے تھے، اُن کے دل بھیڑ کے تن آسانی والے مذہب کی طرف مائل ہو گئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اُن کی فطرت بدل گئی، دانتوں کی تیزی جاتی رہی اور شرارے برسانے والی آنکھوں کی ہیبت ختم ہو گئی۔ اُن کے دلوں سے عمل کا جذبہ رخصت ہو گیا اور اُنہوں نے اپنی عزت، اعتبار، اقبال، اقتدار کی قوت اور آزادی کا جذبہ سب کھو دیا۔ بدن کی قوت کم ہو گئی اور جان کا خوف بڑھ گیا۔ خوف کی وجہ سے مفلسی، کم ہمتی اور پست فطرتی پیدا ہو گئیں۔ وہ اپنے اس انحطاط کو تہذیب کہنے لگے۔

ادب اور افکار

یونانی فلسفی افلاطون ایسی ہی ایک بھیڑ تھا۔ اُس کی فکر نے مسلمانوں کے تصوف اور ادب کو بری طرح متاثر کیا اور اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے آپ کو اُس کے نظریات سے بچائیں۔

وہ ایک تصور پرست شخص تھا جس کا تخیل حقیقت کی دنیا میں کام کرنے سے قاصر رہا اور اس لیے ہاتھ، آنکھ اور کان کے دیے ہوئے علم پر سے اس کا اعتبار جاتا رہا۔ اس کے نزدیک مرجانا ہی زندگی کا راز ہے؛ جیسے شمع بجھ جانے کے بعد مزید روشن ہو جائے! وہ فلسفی کے بھیس میں ایک بھیڑ ہے مگر پھر بھی ہمارے دَور کے صوفیوں کی روح اُسی کے افکار کے آگے جھکتی ہے۔

زندہ روح کے لیے مظاہر کی یہ دنیا بڑی پیاری چیز ہے۔ مردہ جان کو عدم کی دنیا ہی زیادہ عزیز ہو سکتی ہے۔ وہ مادی کائنات پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اُس نے ان دیکھے ''تصورات'' ایجاد کیے اور آنے والی بہت سی نسلوں کے افکار کو زہر آلود کیا۔

ادب کا مقصد حسن کی تخلیق ہونا چاہیے کیونکہ حسن ہی آرزو کو پروان چڑھاتا ہے۔ آرزو زندگی کی تخلیق کرتی ہے اور اس کی بقا کی ضامن ہے مگر یہ حسن کے لیے عشق کا پیغام بھی ہے۔ لہٰذا جو چیز بھی اچھی، خوبصورت اور خوشنما ہے وہ ہماری زندگی کی جدوجہد میں ہماری رہنما ہے اور شاعر کا کام یہ ہے کہ ایک خوبصورت چیز کو مزید خوبصورت بنا دے۔ شاعر کے سینے میں حسن بے نقاب ہوتا ہے اور اس کی نگاہ گلاب کو اور بھی رنگین تر اور فطرت کو اور بھی زیادہ مسحور کن بنا دیتی ہے۔ اس کی گھنٹی کاروان کو بیدار کرتی ہے اور اُسے زندگی کی جنت کی طرف لے جاتی ہے۔ اُسی کے جادو سے زندگی ترقی پاتی ہے اور اپنا محاسبہ کرتی ہے اور آگے بڑھنے کے لیے بے تاب ہوتی ہے۔

اُس قوم کے دن گنے جا چکے جو خود کو موت کے حوالے کر دے اور جس کے شاعر زندگی کی لذت سے پیٹھ موڑ لیں کیونکہ پھر اُن کا آئینہ خوبصورتی کو بدصورتی بنا کر دکھاتا ہے، ان کا شہد دل میں سیکڑوں کانٹے چبھو دیتا ہے، ان کا بوسہ گلاب سے اس کی تازگی چھین لیتا ہے۔ وہ تمہیں تخیل کے سمندر میں غرق کر دیتے ہیں اور تمہیں عمل کے قابل نہیں چھوڑتے۔ اُن کے بیان کیے ہوئے حسن کا سچائی سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ وہ بیمار ہوتے ہیں اور اُن کے کلام سے ہماری بیماری میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

اے کہ تم ایسے شاعروں سے مسحور ہو چکے ہو، تمہارے کانوں میں مہلک زہر اُنڈیلا گیا ہے۔ تمہارا اندازِ زندگی ہی تمہارے انحطاط کی دلیل ہے اور اسلام کے لیے شرمندگی کا باعث ہے۔

عشق کو خودی کے استحکام کا باعث بننا چاہیے مگر دیکھو اپنی کج روی سے تم نے عشق کا کیسا نقش ابھارا ہے۔ تمہارے تخیل میں عشق زرد چہرے اور ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ مضمحل اور بچوں کی طرح آنسو بہاتا نظر آتا ہے۔ وہ لمبی لمبی آہیں بھرتا رہتا ہے، مے خانوں کے دروازوں پر بھیک مانگتا اور چلمنوں سے حسن کی جھلک چراتا نظر آتا ہے۔ اس کی زبان پر ہمیشہ زمانے کا گلہ رہتا ہے۔ خوشامد اور کینہ اس کے آئینے کا جوہر ہیں۔ یہ عشق نہیں بلکہ بیمار تخیل کا ایک واہمہ ہے۔

اپنے ادب کی اصلاح کرو۔ واضح سوچ عمل کا راستہ دکھاتی ہے بالکل اسی طرح جیسے بجلی کی کڑک سے پہلے اس کی چمک نظر آتی ہے۔ اگر ہند اور ایران کی بہار نے تمہیں آسائشوں میں گرفتار کر دیا ہے تو عرب کے صحرا کی جھلسا دینے والی گرمی کی طرف لوٹ جاؤ۔ اپنے جسم اور روح کو زندگی کی آگ میں جلنے دو تاکہ تم زندگی کی جنگ لڑنے کے قابل ہو سکو۔

اگر ایک صحت مند تخیل چاہتے ہو تو اپنی شاعری پر زندگی سے تنقید حاصل کرو۔

خودی کی تربیت

خودی کی تربیت کے تین مرحلے ہیں: اطاعت، ضبطِ نفس، اور نیابتِ الٰہی۔

اونٹ صابر اور اطاعت گزار ہے۔ وہ ریتلے راستوں میں خاموشی سے چلتا ہے اور اپنے سوار کو ساز و سامان سمیت اُٹھا کر خوش خوش آگے بڑھتا رہتا ہے۔ وہ کم کھاتا اور کم سوتا ہے اور اپنے سوار کی نسبت زیادہ صبر کے ساتھ منزل کی طرف گامزن رہتا ہے۔ اسی طرح تم بھی بہترین مقام حاصل کرو گے اگر فرائض کے بوجھ سے رُوگردانی نہ کرو۔

وہ انسان جو سورج اور ستاروں کو مسخر کرتا ہے اسے اصولوں کا پابند بھی بننا پڑے گا۔ ہوا جب پھول کے اندر قید ہوتی ہے تو خوشبو بن جاتی ہے اور خوشبو جب ہرن کے نافے میں قید ہوتی ہے تو مشک بن جاتی ہے، اور ایک بے قدر و قیمت شخص بھی اطاعت کے ذریعے قابلِ قدر بن جاتا ہے جبکہ سرکشی آگ کو راکھ میں تبدیل کر دیتی ہے۔

پیغمبر خداؐ کے بتائے ہوئے اصولوں کی خلاف ورزی نہ کرو۔ خدا کے قانون کی سختی کی شکایت نہ کرو۔ اے پرانی روایت سے آزاد ہو جانے والے، اپنے پیروں میں پھر وہی چاندی کی زنجیر ڈال لو!

انسان کو بہر حال اونٹ سے برتر ہونا چاہیے۔ اونٹ اپنی باگ اپنے ہاتھ میں نہیں رکھ سکتا! اونٹ صرف اپنے لیے جیتا ہے، اور اسی لیے دوسرے اسے قابو کرتے ہیں۔ نفس بھی خود پرست، خود مختار اور اپنی مرضی کا مالک ہے؛ جو لوگ خود اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتے انہیں دوسروں کا حکم ماننا پڑتا ہے۔

جب تمہیں مٹی کے گارے سے تخلیق کیا گیا تو اُس میں محبت اور خوف کی آمیزش کی گئی۔ دنیا کا خوف، آخرت کا خوف، جان کا خوف اور مال و دولت، وطن اور بال بچوں کی محبت۔ اپنے آپ پر قابو پانا ہی تمام عبادتوں کا مقصد ہے، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ۔ تم ہر خوف کے سحر کو توڑ سکتے ہو اگر سختی سے اِس یقین پر قائم رہو کہ ''کوئی معبود نہیں، سوائے اللہ کے۔''

خدا کا نائب بننا بڑی بات ہے اور اگر تم اپنی روح کے اونٹ کو قابو میں لا سکو تو دنیا پر حکومت کر سکتے ہو۔ خدا کا نائب اس کائنات کی روح ہے۔ اُس کا وجود اللہ کے اسمِ اعظم کا عکس ہے۔ وہ جزو اور کل کے اسرار سے واقف ہوتا ہے، دنیا میں خدا کے حکم کو نافذ کرتا ہے اور نئے دور تخلیق کرتا ہے۔

خدا نے آدم کو تمام اشیاء کے نام اسی لیے سکھائے تھے۔ وہ اپنی قوت خدا ہی سے حاصل کرتا ہے۔ وہ خدا کے اس قول کے معانی کی گہرائی کو ظاہر کرتا ہے جو اس نے رسولِ پاکؐ کی معراج سے متعلق کہا کہ سب عزّت اُس کے لیے ہے جو اپنے بندے کو ایک رات میں اوپر لے گیا۔

وہ انسانیت کی کھیتی کا حاصل ہے اور اُس کی پوشیدہ ہستی زندگی کے ساز کا نغمہ ہے جسے ابھی سنا نہیں گیا۔ وہ زندگی کی ایک نئی تفسیر کرتا ہے اور اس خواب کو ایک نئی تعبیر دیتا ہے۔

حضرت علیؑ جو پہلے مسلمان اور اسلام کی قوت تھے، اُنہیں رسول اللہؐ نے بوتراب، یعنی مٹی پر حکومت کرنے والا، کا لقب دیا اور قرآن نے انہیں ''یداللہ'' قرار دیا۔ علی کے ان ناموں کے اصل معنی خود زندگی کے رازوں سے جڑے ہوئے ہیں۔

یہ تاریک خاک جو ہمارا بدن ہے، یہ ہماری عقل اور ہماری دور رس فکر کا راستہ روکتی ہے۔ یہ ہماری آنکھوں کو اندھا اور ہمارے کانوں کو بہرہ کر دیتی ہے؛ اور اس کے ہاتھوں میں ہوس کی دودھاری تلوار ہے جو اس راہ کے مسافروں کے دلوں کو توڑ دیتی ہے۔ علی، شیرِ خدا، نے بدن کی خاک کو مسخر کر لیا اور اس

کی ماہیت تبدیل کردی اور بدن پر اس طرح فتح پانے کی وجہ سے وہ بوتراب کہلائے۔ جو کوئی بھی بوتراب بن جاتا ہے، وہ سورج کو مغرب سے لوٹا سکتا ہے اور خود آگاہی کے ذریعے یداللہ بن سکتا ہے۔ وہ علم کے شہر کا دروازہ بن جاتا ہے، اور دنیا پر حکومت کرتا ہے۔

خاک ہوجانا پروانے کا مذہب ہے؛ اپنی خاک کو فتح کرنا اور اس کے جوہر کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنا ہی انسان کو زیب دیتا ہے۔ تم جو گلاب کی طرح نازک ہو، پتھر کی طرح سخت بن جاؤ، کیونکہ اگر تم خود اپنی خاک سے اپنے لیے دیوار و در تعمیر نہیں کرو گے تو کوئی اور تمہاری خاک سے اینٹیں بنالے گا۔

قوت ہی زندگی کا واحد قانون ہے، کیونکہ زندگی قوت ہی کے اظہار کا نام ہے۔ قوت ہی سے باطل حق کی شان اختیار کرلیتا ہے اور قوت کے ذریعے وہ حق کو جھٹلا کر خود کو حق ثابت کردیتا ہے۔ وہ خیر سے کہتا ہے، ''تم شر ہو،'' اور خیر شر بن جاتا ہے۔

تم جو ایک ایسے شیشے کی مانند ہو کہ پتھر کی ناانصافی پر فریاد کرتا ہے، یہ نالہ و فریاد اور سینہ کوبی کب تک کرتے رہو گے؟ کمتر روحوں کے پاس افسوس کرنے کے سوا کوئی ہتھیار نہیں ہوتا جبکہ بہادر روحوں کی صلاحیتیں مشکلات کا سامنا کرنے ہی سے ظاہر ہوتی ہیں۔

ایک نوجوان اور علی ہجویری

علی ہجویری داتا گنج بخش کے بارے میں یہ کہانی پورے گلشن کو ایک کلی میں سمو دیتی ہے۔

ایک نوجوان مرو سے لاہور آیا۔ وہ سرو کی طرح طویل قامت تھا مگر دشمنوں کے ہاتھوں پریشان تھا۔ ''میں پتھروں کے درمیان شیشے کی طرح ہوں،'' اس نے درویش سے فریاد کی۔ ''مجھ پر کرم کیجیے اور مجھے دشمنوں میں زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھایئے!''

''تمہارے دشمن تمہارے دوست ہیں،'' داتا صاحب نے جن کی فطرت میں عشق نے جلال اور جمال اکٹھے کردیے تھے نوجوان کو جواب دیا۔ ''دشمن کے وجود سے تمہارے جوہر کھلتے ہیں۔ راہ کی دشواریوں سے عزم پختہ ہوتا ہے اور اگر تم اپنی خودی مضبوط نہیں کرتے تو کھانے پینے اور سونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ پتھر اگر خود کو شیشہ سمجھے گا تو بالآخر چکنا چور ہوجائے گا۔ اگر مٹ جانا چاہتے ہو تو اپنی خودی سے بے تعلق ہوجاؤ۔ اگر جینا چاہتے ہو تو اپنی خودی کو مضبوط کرو۔

''موت میں روح جسم سے نہیں نکلتی بلکہ انسان اپنی خودی سے بیگانہ ہوجاتا ہے۔ خودی پر نگاہ رکھو اور صاحبِ عمل بنو۔ مردِ خدا بنو اور اس کے بھید حاصل کرو۔''

یہی نکتہ ایک اور کہانی سے بھی واضح ہوتا ہے۔ ایک پیاسے پرندے نے ہیرے پر چونچ ماری کیونکہ پیاس کے مارے وہ اسے پانی کا قطرہ سمجھ بیٹھا تھا۔ ''میں شبنم نہیں ہوں اور میں کسی کی پیاس نہیں بجھاتا،'' ہیرے نے پرندے سے کہا۔ ''میں دُوسروں کی خاطر زندہ نہیں رہتا۔ میں وہ ہوں جس سے ٹکرا کر پرندے کی چونچ سلامت نہیں رہ سکتی اور اگر انسان بھی مجھے نگل لے تو زندہ نہیں بچتا!'' پرندے نے جلد ہی شبنم کا ایک قطرہ تلاش کرلیا جو ایک کلی سے ٹپکنے ہی والا تھا اور سورج سے خوفزدہ تھا۔ وہ آسمانوں سے آیا تھا اور اپنے حسن کے اظہار کے لیے ایک پھول پر ٹھہر گیا تھا مگر اس نے زندگی سے کچھ حاصل نہیں کیا تھا۔ پرندے نے اُسے نگل لیا اور وہ ختم ہوگیا۔

میں حقیقت کا دروازہ کھولنے کے لیے ایک اور حکایت سناتا ہوں۔ کوئلہ کان میں پڑا ہیرے سے کہہ رہا تھا، ''ہم دونوں ساتھی ہیں اور ہماری اصل ایک ہے، مگر کیا وجہ ہے کہ تمہارے ہر کنارے سے شعاعیں پھوٹتی ہیں جبکہ میں اس قدر بدصورت ہوں کہ مٹی سے بھی زیادہ بے قیمت ہوں۔'' ہیرے نے جواب دیا، ''تاریک خاک جب سخت ہوجاتی ہے تو اس کی عزت بڑھ جاتی ہے۔ جب وہ اپنے حالات سے لڑتی ہے تو یہ جدوجہد اسے پختہ بنا دیتی ہے اور وہ پتھر کی طرح سخت ہوجاتی ہے۔ یہی پختگی ہے جس نے مجھے پتھر کی طرح بنا دیا ہے جبکہ تم جل جاتے ہو کیونکہ تمہارا بدن نرم ہے۔''

خوف، غم اور وسوسوں سے نجات حاصل کرو۔ پختہ ہوجاؤ، اور ہیرا بن جاؤ۔

معاشرے میں رہنا

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ بنارس میں ایک معزز برہمن رہتا تھا، اس کا ذہن فکر کے سمندر میں غرق رہتا تھا مگر پھر بھی وہ ہستی و نیستی کے اسرار کو نہیں کھول سکا تھا۔ ایک دن وہ ایک باکمال شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا جن کے سینے میں سونے جیسا دل تھا۔

''اے بلند آسمانوں میں بھٹکنے والے!'' شیخ نے برہمن سے کہا، جو نصیحت حاصل کرنے کے لیے بے چین تھا۔'' کچھ وقت کے لیے اپنی خاک کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاؤ۔ اگر تم کافر ہو تو اپنے کفر پر ثابت قدم رہو کیونکہ اگر ایک قوم کی زندگی کا انحصار اتحاد پر ہے تو کفر بھی اتحاد کی بنیاد بن سکتا ہے۔ اے قدیم تہذیب کے وارث! اپنے آباء واجداد کے مسلک سے پیٹھ نہ پھیرو۔''

ایک دفعہ دریائے گنگا نے ہمالیہ کے دامن پر آ کر کہا،'' خدا نے تمہیں آسمانوں کا راز دار بنایا مگر تمہارے قدموں کو چلنے کی طاقت سے محروم رکھا۔ تمہارا یہ وقار اور تمکنت کس کام کی کیونکہ زندگی تو مسلسل حرکت کا نام ہے اور تم اس سے محروم ہو۔''

ہمالیہ غصے کے مارے آگ کے سمندر کی طرح بھڑک اٹھا اور جواب دیا،'' تمہارا پانی اپنی ساری وسعت کے ساتھ میرے لیے آئینے کا کام دیتا ہے اور تم جیسے سیکڑوں دریا میرے سینے میں موجود ہیں۔ تمہارا یہ تیزی سے چلنا ہی تمہارے زوال کا سبب ہے کیونکہ جو کوئی اپنی اصل سے دُور ہو جاتا ہے اُس کی موت یقینی ہے۔ تم اپنی حرکت کی طاقت پر غرور کرتے ہو مگر تم یہ نہیں سمجھتے کہ تم اپنے وجود کو سمندر کے حوالے کر دیتے ہو۔ باغ میں کھلے ایک گلاب کی مانند اپنی جگہ پر جمے رہو اور اپنی خوشبو کو بکھیرنے کے لیے کسی گل فروش کے پاس مت جاؤ۔ زندگی یہ ہے کہ اپنی ذات کے اندر رہ کر نشوونما پائی جائے اور خود اپنی ہی کیاری سے پھول چنے جائیں۔

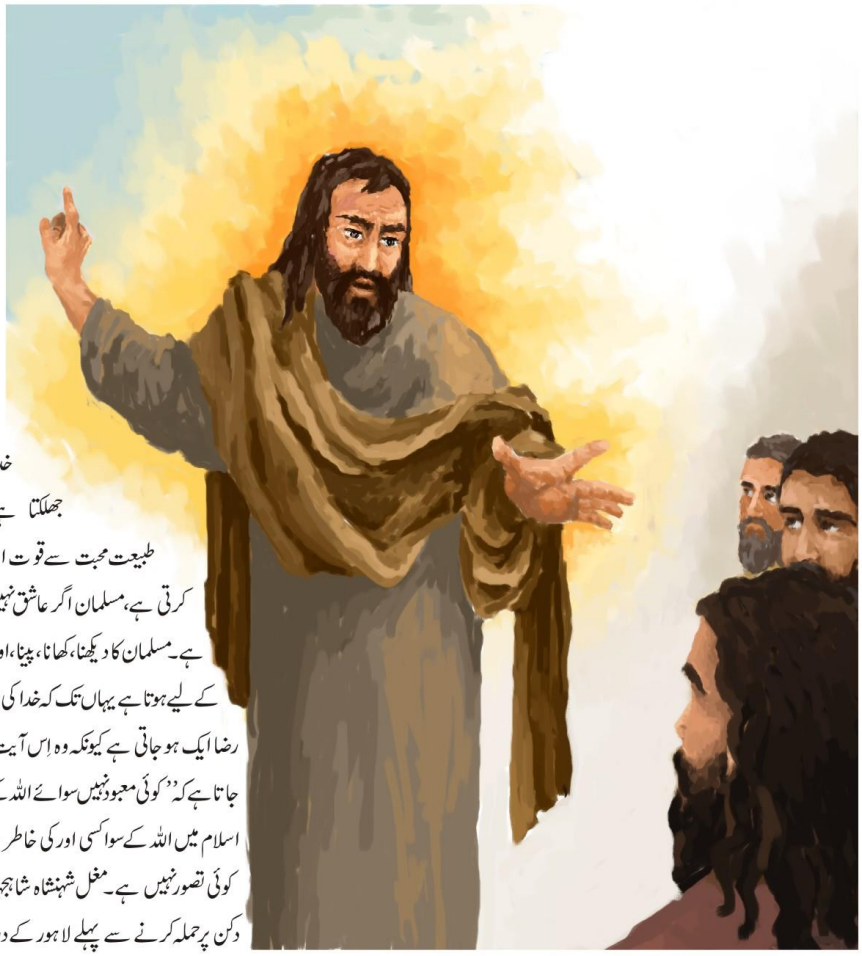

قومی زندگی کے تسلسل کا دارومدار اپنی ملت کی مخصوص روایات سے وابستہ رہنے پر ہے اور ایک مسلمان کے دل میں خدا کا رنگ جھلکتا ہے۔ اُس کی طبیعت محبت سے قوت اور غلبہ حاصل کرتی ہے، مسلمان اگر عاشق نہیں ہے تو کافر ہے۔ مسلمان کا دیکھنا، کھانا، پینا، اور سونا سب خدا کے لیے ہوتا ہے یہاں تک کہ خدا کی رضا اور اُس کی رضا ایک ہو جاتی ہے کیونکہ وہ اِس آیت کی دلیل بن جاتا ہے کہ ''کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے۔''

اسلام میں اللہ کے سوا کسی اور کی خاطر جنگ کرنے کا کوئی تصور نہیں ہے۔ مغل شہنشاہ شاہجہاں ایک دفعہ دکن پر حملہ کرنے سے پہلے لاہور کے درویش حضرت میاں میر کی خدمت میں حاضر ہوا تا کہ اُن سے فتح کی دُعا کے لیے درخواست کرے۔ ''مسلمان اِس دنیا سے خدا کی طرف رجوع کرتا ہے اور اپنی تدبیر کو دعاؤں سے مستحکم کرتا ہے،'' بادشاہ نے کہا۔

شیخ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اتنے میں ایک مرید اُن کے پاس ایک چاندی کا سکّہ لے کر آیا۔ ''یہ میں نے اپنے خون پسینے سے کمایا ہے،'' غریب مرید نے کہا۔ ''مہربانی فرما کر اسے میری طرف سے قبول کیجیے۔''

''اِن پیسوں کی ضرورت تو ہمارے بادشاہ کو ہے،'' درویش نے کہا۔ ''یہ شاہی بھیس میں ایک بھکاری ہے۔ اس کی آنکھیں ہمیشہ دوسرے کے دسترخوان پر جمی رہتی ہیں، اس کی بھوک نے ایک پوری دنیا کو پھونک ڈالا ہے، اس کی تعمیر نے ایک وسیع علاقے کو ویران کر دیا ہے اور اس کی

فتح کا نتیجہ ہمیشہ قحط اور بیماری کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یہ خود فریبی کی وجہ سے اپنی لوٹ کھسوٹ کو اپنی سلطنت کہتا ہے لیکن اس کی فتح موت لے کر آتی ہے، نہ صرف اس کے دشمنوں کی بلکہ اس کے اپنے سپاہیوں کی بھی! ایک عام بھکاری کی بھوک صرف اُس کی روح کو جلا ڈالتی ہے مگر ایک بادشاہ کی بھوک ریاست اور مذہب کو تباہ کر ڈالتی ہے۔ جو کوئی حق کے سوا کسی اور وجہ سے تلوار اٹھاتا ہے اس کی تلوار اس کے اپنے ہی سینے میں پیوست ہو جاتی ہے۔''

اب میں ہندوستان[1] کے مسلمانوں کے لیے کچھ نصیحتیں بیان کروں گا۔ یہ میرنجات نقش بندی کی نصیحتیں ہیں جنھیں بابائے صحرائی بھی کہتے ہیں۔[2]

اول، اپنی ذات کے گرد طواف کرو۔ زندگی دوسروں کے گرد طواف کرنے سے آزاد ہو جانے کے سوا کچھ نہیں۔

دوم، یاد رکھو کہ رومی نے علم کے بارے میں کیا کہا تھا: ''اگر علم کو جسم کی خدمت پر مامور کرو گے تو وہ ایک سانپ بن جائے گا۔ اگر علم کو دل میں اُتارو گے تو وہ تمہارا دوست ہے۔''

سوم، اپنے علم کی تکمیل روحانی جذبے سے کرو۔ تم نے وہ واقعہ تو سنا ہوگا کہ رومی کو علم کے حقیقی معنی سے واقفیت کیسے ہوئی۔ شروع میں وہ حلب میں فلسفے کا درس دیا کرتے تھے۔ وہ علم کے معاملے میں پورے تھے مگر عشق اور اُس کے جنون سے نا آشنا تھے۔ مشہور درویش شمس تبریز اُن کے مدرسے میں پہنچے اور پکارے، ''یہ سارا شور وغل کیا ہے؟''

''اے بے وقوف! ٹھہر جا،'' رومی نے کہا۔ ''فلسفیوں کی تحریروں کا مذاق مت اڑا؛ میرے مدرسے سے نکل جا۔ یہ استدلال اور بحث ومباحثہ ہے: تیرا اس سے کیا کام؟'' ان الفاظ نے شمس تبریز کے غصے کو بھڑکا دیا، ان کی روح میں ایک آگ بھڑک اٹھی اور کتابوں کے اُس ڈھیر کو جلا ڈالا جو رومی کے گرد بکھرا ہوا تھا۔ ''تم نے یہ آگ کیسے جلائی جس نے فلسفیوں کی کتابوں کو جلا ڈالا ہے؟'' رومی چلّائے اور تبریز نے جواب دیا، ''اے نہ ماننے والے مومن، یہ نظر اور حال ہے: تیرا اس سے کیا کام؟ میری کیفیت تیری سوچ سے ماورا ہے، اور میرا شعلہ کیمیا کا پتھر ہے۔''[3]

دورِ حاضر کے علم سے عشق کی گرمی مت ڈھونڈو۔ یہ زندگی کے پل پر سے گزرتے ہوئے نیچے گر چکا ہے، اس کی فطرت کو عشق کی روشنی نے نہیں چھوا، اور یہ ہمیشہ ایک بے لذت جستجو میں مصروف رہتا ہے۔

چہارم، اپنی خودی کی طرف واپس آؤ۔ تم قرآن کی حکمت کے امانت دار ہو۔ اپنا کھویا ہوا اتحاد دوبارہ حاصل کرو۔

پنجم، روحانیت کے نام پر واہموں کے پیچھے نہ بھاگو۔ ہمارے مشائخ صرف اپنے سفید بالوں کی وجہ سے مرشد بنے ہیں ورنہ وہ گلیوں میں بچوں کے لیے ہنسی کا سامان ہیں۔ حقیقی ایمان رہبانیت میں کھو گیا ہے۔ اپنی اصل کسی دوسرے کی دکان میں مت ڈھونڈو اور دورِ حاضر کی ضرورت کو سمجھو۔

۱۔ 'ہندوستان' سے مراد اس وقت کا برطانوی ہند ہے جس میں آج کا پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش شامل ہیں۔

۲۔ یہ ایک فرضی کردار معلوم ہوتا ہے۔ اقبال نے ایسے فرضی حکیم اپنی کئی دوسری کتابوں میں بھی متعارف کروائے ہیں، مثلاً ضربِ کلیم میں محراب گل افغان اور ارمغانِ حجاز میں ملا ضیغم لولابی کشمیری۔

۳۔ ان دونوں کی ملاقات کے اس بیان کو حرف بہ حرف نہیں لینا چاہیے: عام طور پر اسے مولانا روم پر شمس تبریز کے اثر کا ایک تمثیلی بیان سمجھا جاتا ہے۔ مولانا روم نے شمس تبریز کو مرشد بنالیا اور خود بھی ایک عظیم روحانی ہستی بن گئے۔

وقت تلوار ہے

خدا امام شافعی پر اپنی رحمت نازل فرمائے، جنھوں نے کہا، ''وقت تلوار ہے!''

میں کیسے بتاؤں کہ اس تیز تلوار کا راز کیا ہے؟ اس کی دھار کی آب و تاب میں زندگی پنہاں ہے اور اس کا مالک امید اور خوف سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ موسیٰ کے ہاتھ میں یہی تلوار تھی جب بحیرۂ قلزم کو دو ٹکڑے کر دیا اور اسے خشک مٹی میں تبدیل کر دیا۔ علیؓ نے اسی تلوار کی قوت سے خیبر فتح کیا۔ تمھیں دنوں کے گزرنے پر ضرور غور کرنا اور وقت کی نشانیوں کو سمجھنا چاہیے۔

واہموں کے بتوں کو توڑ دو۔ وقت کی طوالت کو دن اور رات کے پیمانے سے ناپنا چھوڑو اور اپنے اندر ایک نیا جہان دریافت کرو!

وقت کی حقیقت سورج کی گردش سے وابستہ نہیں، کیونکہ وقت ہمیشہ رہنے والا ہے اور

سورج نہیں ہے۔ ہمارا وقت، جس کا نہ آغاز ہے نہ انجام، ہمارے اندر کے باغ میں نمو پاتا ہے۔ یہی سورج اور ستاروں کی روشنی کا راز ہے۔ ''وقت کو برا مت کہو، کیونکہ وقت خدا ہے،'' پیغمبرِ خداؐ نے کہا تھا۔ وقت زندگی کا راز ہے، اور زندگی وقت کا راز ہے۔

وقت کو یک رخی حرکت سمجھ کر تم نے اسے اپنی زنجیر بنا لیا ہے۔ تم حق کا بھید بن کر پیدا ہوئے مگر باطل ہو کر رہ گئے۔

پیغمبرِ خداؐ کے اس ارشاد کے معنی کو سمجھو کہ ''مجھے اللہ کے حضور میں ایسا وقت میسر ہے جو کسی نبی اور فرشتے کو حاصل نہیں،'' اور اپنے آپ کو دوبارہ زندہ کر لو!

میں تمہیں غلام اور آزاد کا فرق بتاتا ہوں۔ غلام دن اور رات کے چکر کا پابند رہتا ہے جبکہ آزاد کے دل میں خود وقت چکراتا پھرتا ہے۔

وہ بھی کیا دن تھے کہ وقت کی تلوار ہمارے مضبوط ہاتھوں سے مانوس تھی۔ ہم نے دلوں میں دین کا بیج کاشت کیا اور حق کے چہرے سے پردہ اُٹھایا۔ ہم نے دنیا کی ہر گرہ کھولی، ہمارے سجدوں نے اِس خاک کا نصیب کھولا۔ حق کی شراب پی کر ہم نے تمام پرانے مے خانے ڈھا دیے۔ اے اہلِ مغرب! اتنامت اکڑو اور ہمیں ناداری کا طعنہ مت دو۔ عہدِ جدید یعنی تمہاری رنگ برنگی دُنیا اسی مٹی سے بنی ہے جو ہمارے قدموں سے اُٹھی تھی۔ موسیٰ اور ہارون کے وارث ہم ہیں، ہم خدا کے دل میں چھپا ہوا راز ہیں۔ پیغمبرِ خداؐ سے پیمانِ محبت کر کے ہم آج اور کل کی فکر سے آزاد ہو گئے ہیں۔

دُعا

اے کائنات کو زندگی دینے والے! ایک بار پھر ہمارے سینوں میں آباد ہو جا اور ہمارے دلوں کو سکون بخش دے۔

ہمیں اتحاد اور قوت عطا کر دے۔ ہم دنیا میں بکھرے ہوئے ستاروں کی طرح ہیں۔ ایک ہی اُمت سے تعلق رکھتے ہیں مگر ایک دوسرے سے بیگانے ہیں۔ ان منتشر اَوراق کی پھر شیرازہ بندی کر دے۔ محبت کے دستور کو پھر عام کر دے اور پھر ہمیں اپنی بندگی پر مامور کر دے۔ ہم جو تیرے عاشق ہیں، اپنی خدمت ہمارے سپرد کر دے۔

لا الٰہ کا راز اور الاّ اللہ کے اسرار ہم پر روشن کر دے۔

مجھے اپنے آنسوؤں کو باغ میں بونے کی توفیق دے کہ میں اس سے ایک ایسی آگ پیدا کروں جو گلِ لالہ کو اور بھی آتشیں بنا دے۔ میں ایک طُور ہوں جس نے اسرار روشن کیے ہوئے ہیں، میری طرف ایک موسیٰ کو بھیج دیجیے۔ میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور میں گناہ گار ہوں مگر میرے دل میں ایک ایسا شعلہ ہے جس نے علم کے بت خانے کو جلا ڈالا ہے۔ میں نے شمع کو آزادی سے جلنا سکھایا ہے لیکن میں خود دنیا سے چھپ کر جلتا رہا ہوں۔ آخر کب تک میں ایک ایسے ساتھی کا انتظار کرتا رہوں گا جو میرا دکھ بٹا سکے؟ کب تک مجھے ایک رازداں کی جستجو کرنا ہو گی؟

میں باغ میں کھلے ایک تنہا گلِ لالہ کی طرح ہوں کہ محفل میں رہ کر بھی اکیلا ہوں۔ مجھے ایک ہمدرد دوست عطا کر دے جو میری فطرت کے رازوں سے واقف ہو، جو عقل کے ساتھ ساتھ دیوانگی بھی رکھتا ہو اور جو بے معنی چیزوں کے فریب میں نہ آئے۔ مجھے ایسا ایک دوست عطا کرتا کہ میں اپنا جنوں اُس کی روح کے حوالے کر دوں اور اُس کے دل میں اپنا چہرہ دیکھوں۔ اپنی مٹی سے اُس کا نقش تراشوں گا۔ اُس کا صنم بھی بنوں گا اور آذر بھی!

رموزِ بے خودی

کوشش کرو اور خود کو بے خودی میں پالو۔ جلدی، بہت جلدی! باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔ (رومی)

انتساب

ملّتِ اسلامیہ کے نام

اگر میں عشق کی بات کروں تو مجھے مت جھٹلاؤ۔ اگر میں نے اِس شراب کا مزہ نہیں چکھا تو کسی اور نے ضرور چکھا ہوگا۔ (عرفی شیرازی)

تم، جسے اللہ نے زمین پر آخری امّت بنا کر بھیجا ہے تا کہ ہر ابتدا کی انتہا تم پر ہو سکے، تم دوسروں کے سحر میں گرفتار کیوں ہو گئے ہو؟ اپنی روح میں عشق کی بنیاد رکھو اور رسول اللہؐ سے کیے ہوئے اپنے پیمان کو دوبارہ استوار کرو۔

جب سے میں نے تمہارے حسن کو بے نقاب دیکھا ہے، یورپ کی خوبصورتی میری نظروں میں پھیکی پڑ گئی ہے۔ شاعر خیالی محبوب کے، اس کے خوبصورت رخساروں اور زلفوں کے گن گاتے ہیں، مگر میں اب تمہارے نغمے گاؤں گا۔ اب میں سمندر ہوں مگر میری موجیں بے قرار نہیں رہیں اور میرے ہاتھوں میں بھنور کا کشکول نہیں ہے۔

میں قصیدہ گوئی نہیں کرتا اور نہ بادشاہ ہوں اور حکمرانوں کے سامنے جھکتا ہوں مگر اے مسلم امّت! میں تمہارے آگے نیاز مندی سے سوز و گداز کا ہدیہ پیش کر رہا ہوں۔ تم میرے رسولؐ کی محبوب ہو اور اسی لیے تم دل کی طرح میرے سینے میں رہتی ہو۔

آدھی رات کے اس سکوت میں جب تمام دنیا گہری نیند میں کھوئی ہوئی تھی، میں خدا سے نالہ و فریاد کرتا تھا کہ وہ اس قوم کے لوگوں کو جو اپنے آپ سے بھی دور ہو گئے ہیں ایک محکم زندگی عطا کر دے۔ ''اے میرے خدا! آخر مجھے کب تک گلِ لالہ کی مانند جلنا پڑے گا اور شبنم کے قطروں سے بھیک مانگنا پڑے گی کہ وہ اس آگ کو ٹھنڈا کرے؟''

میری فطرت میں عشق کے اَسرار بے نقاب ہیں۔ میری آواز خس و خاشاک کو آگ کی فطرت عطا کرتی ہے اور ایسے پھول پیدا کرتی ہے جو عشق کے سینے پر زیب دیتے ہیں۔ ایسا ہی ایک پھول میں اب تمہیں پیش کرتا ہوں: عشق کے دل پر گلِ لالہ کی طرح ایک ہی داغ ہوتا ہے اور اپنے سینے پر ایک ہی پھول سجا کر رکھتا ہے۔ خدا کرے تم اپنی گہری نیند سے بیدار ہو جاؤ، تمہاری خاک سے ایک بار پھر گلِ لالہ کھل اٹھیں جو بہار کی ہوا کو خوشبو سے بھر دیں۔

تمہید: فرد اور معاشرہ

فرد اور جماعت کے درمیان تعلق باعثِ رحمت ہے کیونکہ اس کا وجود ملت ہی سے کمال حاصل کرتا ہے۔ فرد اور جماعت ایک دوسرے کے لیے آئینے کا کام دیتے ہیں۔ فرد کی عزت ملت سے ہے اور ملت افراد سے وجود میں آتی ہے۔

فرد ایک قطرے کی مانند ہے جو جماعت میں گم ہو کر سمندر بن جاتا ہے۔ فرد کی روح قدیم روایات کا خزانہ اور تابناک مستقبل کا راستہ بن جاتی ہے۔ ایک قوم میں فرد ماضی اور مستقبل کے درمیان رابطہ بن جاتا ہے۔

قوم ہی فرد کا جسم ہے اور قوم ہی اس کی روح ہے۔ یہی اُس کے جسم و جاں کی پرورش کرتی ہے اور اُس کے دل کو نشو و نما کی لذت سے سرشار کرتی ہے۔ افراد کے اعمال کی قدر قوم کی ضروریات ہی سے متعین ہوتی ہے۔ تنہا فرد اعلیٰ مقاصد سے غافل رہتا ہے اور اُس کی قوت، کمزوری کی طرف بڑھتی رہتی ہے۔ قوم ہی اُسے نظم و ضبط دیتی ہے، اُسے جڑیں اور محبت فراہم کرتی ہے۔ تم خودی اور بے خودی کا فرق نہ سمجھنے کی وجہ سے وہم و گمان کا شکار ہو گئے ہو۔

خودی تمہاری خاک میں موجود نوری جوہر ہے جس کی ایک شعاع تمہارے فہم و ادراک کو منور کر دیتی ہے۔ اسی کے عیش اور غم سے تمہارے عیش اور غم پھوٹتے ہیں اور اس کے ہر لحظہ انقلاب پر تمہاری زندگی کا دار و مدار ہے۔ خودی یکتا ہے اور دُوئی گوارا نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ میں، میں ہوں اور تم، تم ہو۔

خودی کی فطرت آزاد بھی ہے اور پابند بھی۔ اس کا ایک ایک جُز کُل کو اپنے اندر سمو لینے کی قوت رکھتا ہے۔ جب یہ اپنی خلوت سے باہر نکلتی ہے اور مظاہر کی دنیا میں قدم رکھتی ہے تو اس کے دل پر 'وہ' کا نقش بیٹھ جاتا ہے، اس کی 'میں' خود سے ٹوٹ کر 'تم' بن جاتی ہے اور اس کی لامحدود آزادی محبت اور دوستی کی زنجیروں میں قید ہو جاتی ہے۔ بہت ساری انفرادی ذاتوں کا فخر اکٹھا ہو کر نیاز مندی کو جنم دیتا ہے اور ہر خودی، جو بذاتِ خود پھول کی ایک پتی ہے، جب جماعت کا روپ دھارتی ہے تو ایک باغ بن جاتی ہے۔

''یہ باتیں فولادی تلوار جیسی تیز ہیں۔ اگر تمہاری سمجھ میں نہیں آتیں تو میرے سامنے سے بھاگ جاؤ۔'' (مولانا روم)

مگر اِس سوال نے فلسفیوں کو صدیوں سے الجھا رکھا ہے کہ معاشرہ پہلے پہل کس طرح وجود میں آیا۔ ہم اس کا حل ماضی میں تلاش نہیں کر سکتے بلکہ انسان کی فطرت پر غور کرنے سے ہی اس نکتے کو سمجھا جا سکتا ہے، جس طرح باغ کو جاننے کے لیے ایک پھول کو چن لیا جائے۔

پوری کتاب کو ایک لفظ میں بیان کر دینے کی صلاحیت ایک پیغمبر ہی میں ہو سکتی ہے۔ اِس طرح وہ ایک اُجڈ قوم کو تہذیب کے اعلیٰ ترین مقاصد کی بلندی عطا کر دیتا ہے۔ وہ حقیقتِ مطلق کے مشاہدے سے فیض حاصل کرتا ہے اور اُس کی نگاہ زندگی کی بکھری ہوئی قوتوں کو اکٹھا کرتی ہے، عقل کو پاکیزگی عطا کرتی ہے، فرد کو دوبارہ متحرک کر دیتی ہے اور اس طرح تہذیب اور معاشرے کو جنم دیتی ہے۔ قوم افراد کے ملنے سے بن تو جاتی ہے مگر اُس کی تعمیر اور تراش خراش رسالت کے ہاتھوں سے مکمل ہوتی ہے۔

توحید

مسلم قوم کی عمارت دو ستونوں پر قائم ہے: توحید اور رسالت۔

اس محدود اور معین دنیا میں عقل آوارہ پھر رہی تھی، توحید کے ذریعے اسے اپنی منزل کا راستہ معلوم ہوا ورنہ یہ بچاری کہاں اور منزل کہاں! توحید کا مطلب انسانیت کی وحدانیت، اور رنگ، نسل اور حیثیت کی تفریق کا خاتمہ بھی ہے۔ یہ جماعت کو ایک ان دیکھی وحدت میں باندھ دیتی ہے۔ حق کی آگ فکر کے آلے کو مادی دنیا کی حدود سے ماورا کر دیتی ہے۔ اس طرح مسلم برادری علاقائی وفاداریوں سے بالاتر ہو جاتی ہے۔ ملک، زمین اور نسل کا تعلق مٹی سے ہے اور مٹی کے ساتھ ہی یہ فنا ہو جاتے ہیں۔ ہماری اصل بنیادیں تو ہمارے دلوں میں پوشیدہ ہوتی ہیں۔

توحید پر یقین ہم میں ناامیدی، غم اور خوف کا بھی خاتمہ کر دیتا ہے جو تمام برائیوں کی جڑ ہیں اور ہماری زندگی کو تباہ کرتے ہیں۔ ناامیدی تمہارے دل پر قبر کے کتبے کی طرح ہے۔ یہ زندگی کو گہری نیند سلا دیتی ہے، روح کی آنکھ کو نابینا کر دیتی ہے اور تمام صلاحیتوں کو مار دیتی ہے۔ غم، ایک نشتر کی طرح رگِ جان میں اتر جاتا ہے۔ یاد کرو جب پیغمبرِ خدا مدینہ کے راستے میں اپنے جانثار ساتھی ابوبکرؓ کے ساتھ اکیلے رہ گئے تو انھوں نے کہا، ''غم مت کرو!''

خوف، موت کی سلطنت کا جاسوس ہے جس کی روح موت کے دل ہی کی طرح تاریک اور سرد ہے۔ اس کے کان زندگی کی حکمت کے چور ہیں اور اس کی آنکھیں زندگی کا نظام درہم برہم کر دیتی ہیں۔ تم دیکھ سکتے ہو کہ تمہارے دل میں جو بھی برائیاں پلتی ہیں ان کی بنیاد خوف ہے۔ دھوکہ، فریب، خوشامد، کینہ اور جھوٹ، سب خوف ہی سے فروغ پاتے ہیں جو خود کو جھوٹ اور ریاکاری کے پردے میں چھپائے رکھتا ہے لیکن ہمت اور جذبہ بلند ہو تو یہ کمزور پڑ جاتا ہے اور اسی لیے نااتفاقی اس کو سب سے زیادہ مسرور کرتی ہے۔

ایک جنگ کے دوران تیر نے کیا صحیح بات کہی جب اس نے کہا، ''چاہے میں ہوا میں پرواز کر رہا ہوں یا ترکش میں پڑا رہوں، میں ایک آگ ہوں۔ جب میں کمان سے نکل کر ایک انسان کے سینے کی طرف جاتا ہوں تو اُس کے سینے کی گہرائیوں میں دیکھ لیتا ہوں۔ اگر میں اس کے دل کو خوف اور ناامیدی کے اندیشوں سے خالی نہ پاؤں تو اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہوں۔ لیکن اگر اس کا سینہ ایک پاکیزہ دل رکھتا ہو جو ایمان کی دولت سے سرشار ہو اور اس کا ظاہر اس کا باطن کے نور سے روشن ہو تو میری آگ اس کے شعلوں سے پانی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور میرا پھل شبنم کی طرح نرم ہو کر گر پڑتا ہے۔

مغل بادشاہ اورنگزیب عالمگیر، جس کی ہندوستان کی مسلم برادری کو متحد کرنے کی کوششوں کو عام طور پر بے سمجھ لوگوں نے صحیح طور پر نہیں سمجھا، وہ کفر والحاد

کے درمیان جنگ میں ہمارے ترکش کا آخری تیر تھا۔ایک دن وہ اپنے ایک غلام کے ساتھ جنگل کی طرف گیا۔ ہر درخت پر پرندے صبح کی ہوا میں خوشی سے گیت گا رہے تھے۔ بادشاہ بھی عبادت میں محو ہو گیا اور اس مجازی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں داخل ہو گیا۔

اچانک انسان کی بُو پا کر جنگل میں سے ایک شیر نکل کر اسی سمت میں آیا۔اس کی دہاڑ سے آسمان پر لرزا طاری ہو گیا جب وہ عالمگیر پر جھپٹا اور اس کی کمر پر پنجہ مارا۔ بادشاہ نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر اپنا خنجر نکالا،اس درندے کا پیٹ چاک کر دیا،اور پھر اپنی عبادت میں مشغول ہو گیا۔

تم بھی اپنے تمام وسوسوں کو عشق میں جلا دو تا کہ تمہارا دل حسنِ ازل کا تخت بن جائے۔خدا کا خوف ہی ایمان کی کتاب کا عنوان ہے جبکہ خدا کے سوا کسی دوسرے کا خوف دراصل چھپا ہوا شرک ہے۔

رسالت

حضرت محمد مصطفیٰؐ کی رسالت پر ایمان ہماری قوم کا دوسرا ستون ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے خدا کے سوا کسی اور کی عبادت کرنے سے انکار کیا اور کعبہ کی تعمیر کی۔انھوں نے خدا سے ایک ایسی امت کی دعا کی جو اُن کی وارث ہو سکے۔ہم وہ چمن ہیں جس کی آبیاری اُن کی بے خواب آنکھوں کے آنسوؤں نے کی ہے۔

حضورِ اکرمؐ کی رسالت خدا کی جانب سے ابراہیمؑ کی دعاؤں کا جواب تھی اور یہ ہمارے گرد ایک خدائی حلقہ ہے جس کا مرکز کعبہ ہے اور اسی تعلق کی قوت اور فضیلت کی وجہ سے اسے کوئی اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتا۔ہم اسی سمندر میں سے جُڑی ہوئی موجوں کی طرح اُٹھے ہیں۔

فرد کا وجود خدا کے ساتھ تعلق سے قائم ہے مگر ملّت کے وجود کی بنیاد پیغمبرؐ ہیں جو تمام دنیا کے لیے رحمت ہیں۔جب بہت سے لوگوں کے دلوں میں ایک مشترکہ مقصد جڑ پکڑتا ہے تب ایک قوم وجود میں آتی ہے اور نبوتِ محمدیؐ کا مقصد تمام انسانوں کے درمیان بھائی چارہ،مساوات اور آزادی کا قیام تھا۔

دنیا میں ہر جگہ پادریوں اور بادشاہوں نے لوگوں کی گردنوں کو غلامی کے حلقے میں گرفتار کیا ہوا تھا۔ رسول اللہؐ حقداروں کو ان کے حقوق دلوانے کے لیے آئے تھے۔ انھوں نے بادشاہوں کا تخت محکوموں کے حوالے کر دیا، محنت کشی کی وقعت بڑھا دی اور آقاؤں کے ظلم کو ممنوع قرار دے دیا، تمام قدیم تعیّشات کا خاتمہ کیا، غلاموں کو آزادی دلوائی اور بنی آدم کی تھکی ہوئی ہڈیوں میں نئی زندگی پھونک دی۔ ان کی پیدائش عہدِ کہن کے لیے موت تھی کیونکہ وہ آخری نبی تھے۔ اور ہم آخری امت ہیں کیونکہ ہمارے ہاتھوں میں انہی کا دیا ہوا جام ہے جسے ساری دنیا میں گردش کرنے کے لیے بھرا گیا ہے۔

حضرت ابوعبیدہؓ اور جابان کی کہانی مسلم بھائی چارے کی ایک مثال ہے۔ حضرت ابوعبیدہؓ آنحضرتؐ کے عظیم صحابی تھے جو آنحضرتؐ کی وفات کے بعد فارس کے خلاف جنگ میں مسلمانوں کی قیادت کر رہے تھے۔ جابان، جو ایرانی فوج کا سپہ سالار تھا، نہایت چالاک اور مکار تھا۔ جب ایک مسلمان سپاہی نے اسے جنگی قیدی بنالیا تو اس نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا اور اپنی زندگی کی بھیک مانگنے لگا۔ سپاہی نے، جو یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا قیدی کون ہے، اس کی جان بخشی کر دی۔ ایران کی شکست کے بعد جابان کی اصلیت معلوم ہوئی تو مسلمانوں نے اپنے سپہ سالار سے اس کے قتل کا مطالبہ کیا۔

''دوستو، ہم مسلمان ہیں،'' ابوعبیدہؓ نے کہا، جن کے عزم کو کسی لشکر کی ضرورت نہ تھی۔ ''ہم ایک ہی رباب کے تار ہیں، اور ایک ہی نغمے کی آواز ہیں۔ قنبرؓ اور بلالؓ جیسے غلاموں کے حلق سے بھی علیؓ اور ابوذرؓ کی آوازیں نکلتی ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک پوری قوم کا امانت دار ہے اور ایک کا عہد پوری قوم کے عہد جتنا ہی معتبر ہے۔ اگرچہ جابان اسلام کا دشمن ہے مگر پھر بھی ایک مسلمان اس کی جان بخشی کر چکا ہے اس لیے کسی مسلمان کی تلوار اس کا خون نہیں بہائے گی۔''

سلطان مراد اور خجند کے معمار کی کہانی مسلم مساوات کی مثال پیش کرتی ہے۔ خجند کا معمار اپنے ہنر میں یکتا تھا مگر جب بادشاہ کو اس کی بنائی ہوئی ایک مسجد پسند نہ آئی، جو شاہی فرمان پر تعمیر ہوئی تھی، تو اُس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔

معمار عدالت میں پہنچا اور بادشاہ کے خلاف مقدمہ دائر کیا۔ ''میں بادشاہ کا غلام نہیں ہوں بلکہ ایک آزاد فرد ہوں،'' اس نے فریاد کی۔ ''میری درخواست کا فیصلہ قرآن کے مطابق کیجیے!''

قاضی غصے کے مارے اپنے ہونٹ کاٹنے لگا اور بادشاہ کو اپنی عدالت میں طلب کیا۔ بادشاہ پر قرآن کا نام سن کر ہیبت طاری ہوگئی، وہ خوف سے زرد ہو گیا اور مجرم کی طرح عدالت میں حاضر ہوا۔ بلند مرتبت بادشاہ معمار کے برابر میں اس طرح کھڑا تھا کہ شرم سے اس کا رنگ گلِ لالہ کی طرح سرخ تھا اور نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اس نے اقبالِ جرم کر لیا۔

''زندگی کا دارومدار قصاص کے قانون پر ہے۔'' قاضی نے کہا۔ ''اسی قانون سے زندگی استحکام پاتی ہے۔ ایک مسلمان غلام ایک آزاد فرد سے کسی طرح کمتر نہیں، اور نہ ایک بادشاہ کا خون ایک معمار کے خون سے زیادہ سرخ ہے۔''

یہ سن کر اس عظیم المرتبت بادشاہ نے آستین ہٹا کر اپنا ہاتھ نکالا۔ معمار خاموش نہ رہ سکا اور پکار اٹھا، ''خدا انصاف کے ساتھ ساتھ رحم کا حکم بھی دیتا ہے۔ میں سلطان کو خدا اور اس کے رسولؐ کے نام پر معاف کرتا ہوں!''

قانونِ محمدیؐ کی شان دیکھو! کس طرح یہ مالک اور غلام کے درمیان برابری قائم کرتا ہے، ٹاٹ کے بوریے کو شاہی تخت کے برابر کر دیتا ہے۔

آزادیِ عشق کے سینے میں پیدا ہوتی ہے، اور جو کوئی خدائے لاشریک کے ساتھ تعلق پیدا کر لیتا ہے وہ باقی تمام چیزوں کے حلقے سے آزاد ہو جاتا ہے۔ عقل خونریز ہے، مگر عشق اس سے زیادہ خونریز ہے، اور اس سے زیادہ پاکیزہ، تیز اور بے باک ہے۔ عقل شک وشبہ میں پڑ کر اسباب وعلل کے چکر میں کھو گئی ہے جبکہ عشق جو

مضبوط ارادے سے مالا مال ہے،عمل کے میدان میں جرأت مندی سے ضرب لگاتا ہے۔عقل ہمیں خود کو دیکھنا سکھاتی ہے جبکہ عشق ہمیں خود کو آزمانا سکھاتا ہے۔عقل ہمیں لذت پسندی پر اکساتی ہے جبکہ عشق ہمیں خدا سے وفاداری کا سبق دیتا ہے اور اس کے ذریعے ہمیں قوت بخشتا ہے۔عشق کی روح آزادی سے تسکین پاتی ہے اور یہی اس کی سواری کو چلانے والی ہے۔امام حسینؓ کا واقعہ اس کی مثال ہے کہ آزمائش کی گھڑی میں عشق کس طرح ہوس پرور عقل سے نبرد آزما ہوتا ہے۔

زندگی دو قوتوں کو جنم دیتی ہے۔پہلی فرعون اور یزید کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور دوسری حضرت موسیٰؑ اور امام حسینؓ کی شکل میں۔جب خلافت پہلی دفعہ قرآن کے بتائے ہوئے راستے سے ہٹی اور مسلم قوم کی آزادی خطرے میں پڑی تو امام حسینؓ ایک بارش برسانے والے بادل کی طرح آئے اور کربلا کی مٹی پر اپنا خون بہایا۔وہ دشمنوں کے ایک پورے لشکر کے مقابلے میں صرف بہتّر ساتھیوں کے ہمراہ روانہ ہوئے اور انھوں نے اپنی جان قربان کردی تاکہ دنیا سے ظلم کا نشان ہمیشہ کے لیے مٹا دیا جائے۔خدا نے ابراہیمؑ کو اپنے بیٹے کی قربانی دینے کا جو حکم دیا تھا،اس کا راز بالآخر اِمام حسینؓ کی قربانی کی شکل میں آشکار ہوا۔

وقت کے ہاتھوں نے ہماری عظمت کو مٹا ڈالا ہے۔دمشق، بغداد اور غرناطہ کی عظمت و شوکت اب ماضی کا قصہ ہیں۔مگر حسینؓ نے جو تار ہماری روحوں میں چھیڑ دیے تھے وہ آج بھی لرز رہے ہیں۔میدانِ کربلا میں 'اللہ اکبر' کا نعرہ جو بلند ہوا تھا وہ ہمیشہ ہمارے ایمان کو تازہ کرتا رہے گا۔

زمان ومکان

چونکہ مسلم برادری عقیدۂ توحید اور رسالت پر قائم ہے اس لیے یہ زمان ومکان کی حدود سے بلند ہے۔

ہمارا جوہر کسی سرزمین سے وابستہ نہیں ہے۔ اس کی تند وتیز شراب کسی جام کی پابند نہیں۔ چینی، ہندی، ترکی اور شامی وہ ٹکڑے ہیں جن سے مل کر ہمارا جام بنا ہے۔

عرب شاعر کعب، جو کبھی آنحضرتؐ کا دشمن تھا، جب تائب ہوا تو آپؐ پر ایک قصیدہ لکھ کر لایا۔ یہ اس کا مشہور قصیدہ ''بانت سعاد'' تھا، جس میں اس نے آنحضرتؐ کو ''ہند کی تلواروں میں سے ایک'' کہہ کر مخاطب کیا تھا، کیونکہ ان دنوں ہندی تلواروں کو بہت پسند کیا جاتا تھا۔ آنحضرتؐ کو یہ نسبت پسند نہیں آئی اور انھوں نے اس کو تبدیل کر کے ''اللہ کی تلواروں میں سے ایک'' کر دیا۔ چونکہ آپؐ کا مقام آسمانوں سے بھی بلند ہے اس لیے کسی خاص سرزمین کے ساتھ نسبت آپؐ کے دل کو خوش نہ کر سکی۔

ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا، ''مجھے تمہاری دنیا میں نماز، خوشبو اور عورت پسند ہیں۔'' لفظ ''تمہاری دنیا'' میں جو گہرائی پنہاں ہے، سمجھنے والے ذہن کو اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ رسول اللہؐ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی اس دنیا سے نہیں تھے۔ وہ اس وقت بھی پیغمبر تھے جب آدمؑ ابھی مٹی اور پانی کے درمیان تھے، لہٰذا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کا تعلق کس سرزمین سے تھا۔ وہ یہاں ہمارے مہمان رہے اور ہمارے درمیان انھوں نے زندگی گزار دی مگر پھر بھی ان زمینی عناصر کو انھوں نے ''ہماری دنیا'' کا قرار دیا۔ اسی طرح ایک مسلمان بھی کسی خاص سرزمین تک محدود نہیں ہے۔

ہمارے تاریخ دان رسول اللہؐ کی ہجرتِ مدینہ کے اصل معنی کو نہیں سمجھ سکے۔ وہ، جن کی زندگی کا ذمہ خود خدا نے لیا تھا، ان کو دشمنوں کے خوف سے فرار ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ مکہ سے مدینہ ہجرت کا مقصد تو دراصل اس قانون کو رائج کرنا تھا جو ایک مسلمان کی زندگی کی راہنمائی کرتا ہے اور ہماری برادری کو استحکام بخشتا ہے: یعنی بے کراں ہو جاؤ اور دنیا میں حدود وقیود کی جستجو مت کرو۔ گلاب کی خوشبو گلاب میں قید نہیں رہتی بلکہ خود کو سارے باغ میں پھیلا دیتی ہے!

دورِ حاضر کی وطن پرستی سے ہوشیار رہو۔ وہ اقوام جو خود تقسیم شدہ ہیں انھوں نے دنیا بھر میں انسانیت کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ یہ سلسلہ تب شروع ہوا جب یورپ نے چرچ کے خلاف بغاوت کی اور پھر شیطان نے میکیاولی کے نام سے اپنا ایک پیغمبر بھیجا جو فلورنس کا فلسفی تھا اور جس نے شہزادہ (*The Prince*) لکھی، جس میں اُس نے سیاست اور فریب کا فرق مٹا دیا۔ اُس نے برادری کی بنیاد لوگوں کے متنازع مفادات پر قائم کی اور پوری دنیا کو نہایت چالاکی سے اس بات کی طرف مائل کیا کہ دنیاوی مفادات کے لیے جنگ اور حیلہ اندازی جائز ہے۔

افراد کی طرح قومیں بھی فنا ہو جاتی ہیں۔ جس طرح ایک فرد کی زندگی کا دریا خشک ہو جائے تو وہ مر جاتا ہے، بالکل اسی طرح ایک قوم کی موت اس وقت واقع ہوتی ہے جب وہ اپنے مقصد کو ترک کر دیتی ہے۔ لیکن مسلم برادری کو ابدی حیات بخشی گئی ہے، جیسا کہ اللہ نے خود قرآن میں کہا ہے، ''ہم نے اس ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔'' اس دنیا میں خدا کا ذکر ہی ہماری امت کی زندگی کا مقصد ہے۔ خدا اپنے وجود پر گواہ چاہتا ہے، اور ہم ہی وہ گواہ ہیں۔

وحشی تاتار کو ہمارے سروں پر مسلط کر دیا گیا اور تاریخ میں ان کی تلواروں سے بڑی قیامت نہیں دیکھی گئی جنھوں نے بغداد کو ایسی تباہی سے ہمکنار کیا جو روم نے بھی نہ دیکھی ہوگی مگر پھر بھی تاتار کی یہ آگ ہمارے لیے پھولوں کا کنج ثابت ہوئی، بالکل اسی طرح جیسے آتشِ نمرود ابراہیمؑ کے لیے گلستان میں تبدیل ہو گئی تھی۔

مسلم قوم وقت کے امتحان میں ثابت قدم رہی ہے جبکہ یونان کے شاندار ذہن کا خاتمہ ہو گیا، روم کی شان وشوکت مدھم پڑ گئی، ساسانیوں کا سنہری جام خون میں ڈوب گیا اور مصر کی ہڈیاں اہراموں کے نیچے دفن ہو گئیں۔

عشق ہی زندگی کا آفاقی اصول ہے جس کے بغیر فطرت کے عناصر اکٹھے ہو کر ایک منظّم دنیا تشکیل نہیں دے سکتے۔ عشق ہمارے دلوں کی گرمی سے زندہ رہتا ہے اور اس کی اپنی آب و تاب کا دارومدار توحید کی چنگاری پر ہے جو ہمارے سینوں میں رہتی ہے۔ خواہ ہم بہار کی منتظر کلیوں کی طرح اُداس ہوں مگر پھر بھی باغ کا وجود ہمارے ہی دم سے ہے!

قرآن

قوم کی تنظیم صرف آئین کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ مسلم قوم کا آئین قرآن ہے۔ پتّیاں ایک آئین کے تحت جُڑ کر گلاب بناتی ہیں اور کئی گلاب اکٹھے ہو کر گلدستہ بناتے ہیں۔ آواز کو ضبط میں لائیں تو نغمہ بن جاتا ہے اور اگر وہ ضبط میں نہ ہو تو محض شور وغل ہے۔ اسی طرح قرآن مسلم امت کا آئین ہے اور اس کی قوت کا راز بھی۔

قرآن ہمیشہ رہنے والا ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی اور اس کی آیات کسی تاویل کی محتاج نہیں کہ ہر چیز اس میں کھول کر بیان کر دی گئی ہے اور یہ شک و شبہ سے بالا تر ہے۔ یہ خدا کا آخری پیغام ہے، جو رسول اللہؐ کے ذریعے ظاہر کیا گیا جنھیں تمام انسانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اِسی طرح قرآن تمام زنجیروں کو توڑ دیتا ہے اور آزاد انسانوں کو سیدھی راہ دکھاتا ہے مگر ظالموں کو بے بس کر دیتا ہے۔ وہ صحرا کا تھکا ہوا اور بھٹکا ہوا بدّو جس کی آنکھیں سورج کی تپش سے سرخ ہو رہی تھیں جب اس کا دل قرآن کی زندگی سے بھرپور حدت بخش روشنی سے منور ہوا تو جمشید کا تخت بھی اُس کے قدموں تلے آ گیا۔

تمہارا ایمان رسومات کا غلام بن گیا ہے۔ اپنی زندگی کا مقصد براہِ راست قرآن میں تلاش کرو۔ اپنے آپ کو اِس دَورِ زوال کے رہنماؤں کے تخیلات کے حوالے نہ کرو بلکہ اپنے اسلاف کی پیروی کرو یہاں تک کہ تمہارے چمن میں بہار آ جائے۔ یہودیوں کو دیکھو کہ صدیوں سے غلامی اور نا اُمیدی کا شکار ہیں مگر پھر بھی وہ آج تک ایک قوم کی حیثیت سے زندہ ہیں کیونکہ وہ اپنے اسلاف کی راہ پر ثابت قدم رہے ہیں۔ حتّٰی کہ جب ان کی قومیت کے لباس کو تار تار کر دیا گیا تو اس وقت بھی موسیٰؑ اور ہارونؑ کی یاد اِن کے سینوں میں زندہ رہی۔

امام جعفر کا ذوق وشوق اور رازی کا سا مجاہدہ اب باقی نہیں رہا۔ تمہارے باغ میں اب خزاں چھا گئی ہے لیکن بہار کو کہیں اور تلاش کرنے کی کوشش میں شجر سے اپنا تعلق مت توڑ۔ ایک ٹوٹی ہوئی شاخ بہار کے آنے سے دوبارہ ہری نہیں ہوسکتی، اور اختلافات زندگی کی رگ کاٹ دیتے ہیں۔

قومی زندگی خدا کے دیے ہوئے آئین سے ہی تکمیل پاتی ہے۔ چنانچہ قرآن سے کوئی اور مطلب نکالنے کی کوشش مت کرو۔ موتی کا باطن بھی اس کے ظاہر کی طرح ہی چمکدار ہوتا ہے اور قرآن وہ موتی ہے جسے خود خدا نے بنایا ہے۔

اسلام کا راز اس کا آئین ہے، جس میں ہر چیز کی ابتدا اور انتہا ہے اور عشق ہی اس کی بنیاد ہے۔ آئین تمہارے سامنے مشکلات کھڑی کر کے تمہاری قوت آزماتا ہے تاکہ تم اپنی روح میں چراغ روشن کرلو اور مشکلات کو ریزہ ریزہ کردو۔ رسول اللہؐ نے، جو ہر جائز اور ناجائز اور صحیح اور غلط کا علم رکھتے تھے، تمہیں قوت کا یہی نسخہ بتایا ہے۔ اسے حاصل کرو اور اپنے گوشۂ عزلت سے نکل آؤ۔

آئینِ خداوندی کا پاک چشمہ اب ہند، ایران اور دوسرے ملکوں کے بیمار نظریات سے آلودہ ہو چکا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اب تمہارا دل اپنی ہی دھڑکن سے ڈر جاتا ہے۔ خدا کے طریقوں کی پاکیزگی کی طرف لوٹ جاؤ اور سچے مسلمان بن جاؤ۔

قومی زندگی

ملت کا حسنِ سیرت رسول اللہؐ کے آداب اختیار کرنے سے ہے۔

میری جوانی کے دنوں میں ایک دفعہ ایک بھکاری ہمارے دروازے پر اٹل تقدیر کی طرح مسلط ہوگیا اور کسی طرح ٹلنے کا نام نہ لیا۔ میں نے اس کے سر پر چھڑی دے ماری اور اُس کے کشکول میں جو بھیک جمع تھی وہ نیچے گر گئی۔ یہ دیکھ کر میرے والد کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اُن کو دُکھی دیکھ کر میرا دل بھی تڑپ اٹھا۔

''حشر کے دن جب آنحضرتؐ کے تمام ماننے والے آپؐ کے گرد جمع ہوں گے،'' والد صاحب نے کہا۔ ''مجاہدین، درویش، شہید اور صوفی! یہ بھکاری وہاں اپنی فریاد سنائے گا۔ اس وقت میں کیا جواب دوں گا جب آنحضرتؐ مجھ سے پوچھیں گے، 'اللہ نے ایک مسلمان نوجوان تمہارے سپرد کیا تھا مگر تم میری درس گاہ سے اسے کوئی سبق نہ دے سکے؟ کیا یہ تمہارے لیے اتنا مشقت کا کام تھا کہ ایک مٹی کے پُتلے کو انسان نہ بنا سکے؟' میرے بیٹے! میرے سفید بالوں کو دیکھو اور مجھے خوف اور امید کے بیچ کانپتے ہوئے بھی دیکھ لو۔

''تم ایک ایسی کلی ہو جو رسول اللہؐ کے باغ کی شاخ سے پھوٹی ہے۔ اُن کی خوبصورت سیرت سے کچھ خوشبو حاصل کرنے کی کوشش کرو اور اُسے یاد رکھو جو عظیم رومی نے کہا تھا: 'اپنی زندگی کا رشتہ ختم الرسلؐ سے نہ توڑو!' وہ اس دنیا کے لیے رحمت بن کر آئے تھے اور ان کی رحمت کا دائرہ پوری دنیا پر محیط تھا۔ اگر تم بلبل ہو تو مرغزاروں کی طرف اڑ جاؤ۔ اگر عقاب ہو تو ویرانوں میں جا کر بس جاؤ اور اگر ستارہ ہو تو آسمان پر چمکو مگر اپنے قدم آنحضرتؐ کی بتائی ہوئی حدود سے باہر مت نکالو۔ بارش کا قطرہ جب سمندر سے نکل جاتا ہے تو ٹہنی پر شبنم کی طرح فنا ہو جاتا ہے مگر جو سمندر کے قلب میں رہتا ہے وہ موتی بن کر نکلتا ہے۔''

مظاہر کی اس دنیا میں خودی کو بھی اپنے وجود کے لیے ایک مشاہداتی پس منظر چاہیے۔ خودی شعلے کی مانند ہے اور جسم اس کی حفاظت کے لیے دھوئیں کے ایک پردے کی طرح ہے۔ برادری کو بھی ایک فرد کی طرح مادّی بدن کی ضرورت ہوتی ہے۔ مسلم برادری کے لیے یہ ظاہری مرکز کعبہ ہے۔

ایک قوم کی روح اجتماعی حیثیت میں ہی زندہ رہتی ہے۔ مکّہ کا وہ پاک گھر بہ یک وقت ہمارا راز بھی ہے اور ہمارے راز کا امین بھی۔ یہ ایک ایسا ساز ہے جس پر ہمارے نغمے پھوٹتے ہیں اور ہم اس کے سینے میں سانس کی مانند پرورش پاتے ہیں۔ یہ ہماری برادری کا مرکز ہے، بالکل اسی طرح جیسے دانے کے قلب میں اس کی روح پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہی وہ قوت ہے جس سے ہم پھلتے پھولتے ہیں۔

یہودیوں نے جب اپنے مرکز کو چھوڑ دیا تو ان کی جمعیت کا رشتہ ٹوٹ گیا اور اپنی زبان تک کھو بیٹھے جو اُن کی مشترکہ زبان تھی۔ وہ قوم جو خدا کے رسولوں کی گود میں پلی تھی، رفتہ رفتہ غموں نے اس کا لہو نچوڑ ڈالا اور میری حقیر خاک اُن کی تاریخ پر لرز اُٹھتی ہے۔

اس کے بعد جو دُوسری ضروری چیز ہے وہ ایک مشترکہ مقصد کو اختیار کرنا ہے۔ مسلم برادری کا مقصد توحید کی حفاظت ہے۔

تم نے قیس کا قصہ تو سنا ہوگا جو لیلیٰ کے عشق میں اس قدر دیوانہ ہوا کہ مجنوں کہلانے لگا۔ وہ صحراؤں میں پھرتا رہا یہاں تک کہ وہاں کے جانور بھی اس کے واقف اور دوست بن گئے۔ کون سی چیز اس کو سفر پر آمادہ رکھتی تھی؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اونچا محمل جس میں لیلیٰ سواری کرتی تھی، وہ صحرا کے اندر ہی کہیں تھا اور قیس اس کو ڈھونڈنا چاہتا تھا۔ مقصد ہی زندگی کے سفر کو جاری رکھتا ہے۔ ہماری لیلیٰ صحراؤں کو چھوڑ کر شہر میں آ گئی ہے لہٰذا اب ہمارے دل صحراؤں میں نہیں لگتے!

فارسی شاعر ملک قمی نے کیا خوبصورت بات کہی ہے۔ قیس کی مثال دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں، ''میں اپنے پاؤں سے کانٹا نکالنے کے لیے جھکا اور محمل غائب ہو گیا۔ ایک ہی لمحے میں مَیں اس راستے پر سو سال پیچھے چلا گیا!'' تمہیں چراغ کا نور بننا اور اس دنیا کو جگمگانا ہے۔ میں تمہاری اُس دن کی شرمندگی کے بارے میں سوچ کر کانپ اٹھتا ہوں جب حشر کے دن آنحضرتؐ تم سے پوچھیں گے، ''تم نے میرے ہونٹوں سے حق کی بات سنی تھی پھر تم اسے آگے منتقل کیوں نہیں کر سکے؟''

اگر تم اِس دنیا کو حقیر سمجھو اور اس پر توجہ نہ دو تو قومی زندگی ترقی نہیں کر سکتی۔ قومی زندگی کی وسعت دنیاوی اسباب کی تسخیر سے ہے۔ جس نے محسوسات کی تسخیر کی، وہ ایک ذرّے سے جہان تعمیر کر سکتا ہے۔ اللہ نے اس دنیا کو نیک لوگوں کی میراث کہا ہے اور اس کے جلووں کو مومن کی نگاہ کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ انسان زمین پر خدا کا نائب ہے اور اس کی حکومت اس زمین پر قائم کر دی گئی تھی جب خدا نے آدم کو چیزوں کے نام سکھائے تھے۔

جن نظریات نے تم پر افیون جیسا اثر کیا ہے اُن کے اثر سے باہر آؤ۔ اگر تم فطرت کی کھلی حقیقتوں سے ہم آہنگ ہو جاؤ تو تمہاری فکر اِس دُنیا سے بلند ہو کر آسمانوں تک پہنچ سکتی ہے۔ اِس دنیا کی ضروریات سے آگاہ ہو جاؤ تا کہ اُن پر قابو پا سکو۔

فرد کی طرح قوم کی بھی خودی ہوتی ہے اور وہ قومی روایات کے تسلسل سے مستحکم ہوتی ہے۔ ایک بچے کی توجہ کا دورانیہ بہت مختصر ہوتا ہے لہٰذا اسے ماں کی گود سے باہر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ وہ ایک سے دوسرے لمحے کا آپس میں تعلق محسوس نہیں کر سکتا، وہ گزرتی ہوئی حقیقتوں میں ایک سے دوسری کے درمیان رابطے کو نہیں پا سکتا۔ بچے کا بڑھنا اصل میں ان رابطوں کو دریافت کرنا اور انہیں اپنی یادداشت میں محفوظ کرنا ہے، تا کہ دنیا کی سمجھ آ سکے۔ اسی طرح، ایک قوم کو بھی اپنے ماضی اور حال کے درمیان رابطے بنانے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ وحدت اس کی تاریخ کے تسلسل کے ذریعے ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔

فرد کی زندگی کے ساٹھ ستّر سال قوم کی زندگی میں ایک سانس کے برابر ہیں۔ قوم کی زندگی کہیں زیادہ طویل ہوتی ہے، اور اسی لیے یہاں نسلوں کے تجربات اگلی نسلوں تک منتقل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ہر فرد اپنی پچھلی نسل کے تجربات کی مجسم شکل ہو تو قوم ذہنی طور پر صحت مند ہو جاتی ہے۔ نسلوں کے درمیان ایک شعوری وحدت قوم کی صحت مند زندگی کی ضامن ہوتی ہے، اور یہ قومی روایات کے تسلسل کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

امومت

عورت کے نیاز سے مرد کا ناز پرورش پاتا ہے۔ یہ وہ ساز ہے جو مرد کو نغمے پر اُکساتا ہے۔ قرآن نے اس کو مرد کے لیے لباس قرار دیا ہے۔ بے شک ایک دل کو گرما دینے والا حسن ہی عشق کے لیے مناسب لباس ہو سکتا ہے۔

عشقِ حقیقی بھی اکثر عشقِ مجازی ہی سے شروع ہوتا ہے۔ رسول اللہؐ نے عورت کا تذکرہ نماز اور خوشبو کے ساتھ کیا ہے۔ جو کوئی بھی عورت کو کمتر سمجھتا ہے اس نے قرآن کے صحیح معانی نہیں سمجھے۔

امومت یعنی ماں ہونا پیغمبری کی مانند ہے۔ ماں اپنے بچے کے لیے اسی طرح رحمت کا باعث ہے جیسے ایک پیغمبر اپنے ماننے والوں کے لیے ہوتا ہے۔ لفظ 'اُمت' اور 'امومت'، دونوں کا ماخذ ایک ہی ہے! ایک جاہل اور بدصورت عورت جو اپنی برادری کے لیے صحت مند فرد کو جنم دیتی ہے، اس پڑھی لکھی خوبصورت عورت سے بہتر ہے جو بے اولاد رہنے کو ترجیح دیتی ہے کیونکہ نسل کے تسلسل کا دارومدار امومت پر ہے اور امومت کا احترام عین اسلام ہے۔ امکانات کا چمن اُن دیکھے پھولوں سے لہلا رہا ہے جو اپنے کھلنے کے لیے ایک ماں کے محتاج ہیں۔

مسلمان عورتوں کے لیے بی بی فاطمہؓ ایک مثالی کردار ہیں۔ اگر بی بی مریمؑ کا مرتبہ اس لیے بلند ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی ماں تھیں، تو بی بی فاطمہؓ ہمارے لیے تین نسبتوں سے قابلِ احترام ہیں: وہ آنحضورؐ کی بیٹی تھیں، حضرت علیؓ شیرِ خدا کی بیوی تھیں، اور امام حسنؓ اور امام حسینؓ کی ماں تھیں۔ امام حسنؓ عشق کے قافلہ سالار تھے، جنھوں نے مسلم برادری کا اتحاد برقرار رکھنے کے لیے تخت و تاج کو ٹھکرا دیا؛ امام حسینؓ دنیا بھر میں آزادی کی روح کے لیے قوت تھے، جن کے وجود نے زندگی کی نغمگی کو پرسوز بنا دیا۔

بی بی فاطمہؓ کا دل اس قدر نرم تھا کہ انھوں نے ایک ضرورت مند کی مدد کرنے کے لیے اپنی چادر ایک یہودی کو بیچ دی۔ فرشتے ان کے ایک اشارے کے منتظر رہتے تھے مگر انھوں نے اپنی مرضی کو اپنے شوہر کی مرضی میں گم کر دیا؛ وہ چکّی پیسا کرتی تھیں اور ان کے ہونٹوں پر قرآنی آیات ہوتی تھیں۔ انھوں نے کبھی اپنے حالات پر آنسو نہیں بہائے البتہ جائے نماز پر آپ کے آنسو موتیوں کی طرح ٹپکتے تھے جنھیں جبرئیلؑ جمع کر لیتے تھے اور انہیں شبنم کے قطروں کی طرح عرشِ بریں پر چھڑکتے تھے۔ اگر خدا کا حکم مجھے نہ روکتا تو میں اُن کی قبر کے گرد طواف کرتا اور اسے سجدہ کرتا!

اے مسلمان عورتو! تمہاری چادریں ہماری ناموس ہیں اور تمہاری پاکیزگی ہماری اُمت کی بنیاد ہے۔ نفع اور نقصان سے بے پروا ہو کر ہماری روایات کی حفاظت کرو۔ ہمارے بچوں کو اس عہد کے مکر و فریب سے بچائے رکھو، اور موجودہ دور کی بے راہ روی کے خلاف جنگ پر آمادہ رہو۔ بی بی فاطمہؓ کی سیرت کو اپنے لیے نمونہ بناؤ تا کہ تمہاری شاخ بھی حسینؓ جیسا پھل پیدا کرے اور ہمارے گلستان میں بہار واپس آ سکے۔

خلاصہ

ایک رات میں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خواب میں دیکھا اور ان کے قدموں میں کھِلے پھولوں میں سے ایک گلاب توڑ لیا۔ ''اے خاصائے خاصانِ عشق!'' میں نے انہیں پکارا۔ ''آپ کے ہاتھوں سے ہماری ملت کی بنیادیں مستحکم ہوئیں۔ مہربانی فرما کر ہمارے موجودہ دکھوں کا کوئی علاج فرمائیے۔''

''آخر کب تک تم مادّی خواہشات کے غلام رہو گے؟ خود کو سورۂ اخلاص سے منور کرو۔''

سورۂ اخلاص میں وہ سب کچھ موجود ہے جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ ''کہو: اللہ ایک ہے؛ تمام چیزوں کا دارومدار اسی پر ہے؛ نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ بیٹا؛ اور کوئی اس کا ہم سر نہیں۔''

یہ کہنا کہ ''اللہ ایک ہے،'' یوں ہے گویا سیکڑوں سینوں میں ایک ہی سانس آ جا رہی ہو اور اس طرح ایک ہی قوم کو تشکیل دیتی ہو۔ توحید ہی ہمیں وحدت کی طرف لاتی ہے، اور ہمیں قومیت، نسل اور علاقائیت سے بالاتر ہو جانا چاہیے۔

یہ کہنا کہ ''ہر چیز کا دارومدار اُسی پر ہے،'' ظاہر کرتا ہے کہ وہ کسی پر انحصار نہیں کرتا، لہٰذا ہمیں بھی دنیا میں کسی کے سامنے جھکنا نہیں چاہیے۔ خلیفہ ہارون نے امام مالک کو، جو حدیث کے ایک بہت بڑے عالم تھے، بغداد میں ایک عہدے کی پیشکش کی۔ امام مالک نے جواب دیا: ''میں رسول اللہؐ کا غلام ہوں اور میں مدینہ نہیں چھوڑوں گا۔ اگر تو مجھ سے حدیث کا علم سیکھنا چاہتا ہے تو تجھے میرے مکتب میں آنا پڑے گا۔ میں تجھے پڑھانے کے لیے تیرے دروازے پر نہیں آؤں گا۔''

خدائی بے نیازی اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا رنگ اختیار کیا جائے اور اپنے لباس سے تمام دوسرے رنگ دھو ڈالے جائیں۔ تو نے غیروں کے دیے ہوئے غازے سے اپنے چہرے کو خوبصورت بنایا ہے اور تیرا ذہن دوسروں کی فکر کا قیدی ہے۔ تو سورج کی مانند ہے، اور اگر تو اپنی خودی پر ذرا سی بھی

نظر ڈال لے تو تجھے دوسرے ستاروں سے روشنی مانگنے کی ضرورت نہ پڑے! کوئی خود کو جانے بغیر کبھی اپنی خودی کو نہیں پا سکتا، اور کوئی قوم دوسروں کی مرضی سے آزاد ہوئے بغیر اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتی۔

یہ کہنے کا مطلب کہ ''نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ بیٹا''، یہ ہے کہ ہماری انسانیت رنگ اور نسل سے بالاتر ہے۔ جب سلمان فارسیؓ سے ان کا شجرہ پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ وہ اسلام کے بیٹے ہیں۔ شہد بہت سے پھولوں سے کشید کیا جاتا ہے مگر تمام قطرے بالکل ایک جیسے ہوتے ہیں اور کوئی قطرہ دوسرے سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ گلِ لالہ سے کشید کیا گیا ہے یا نرگس سے۔

جب صحابیٔ رسولؐ ابنِ مسعودؓ کے بھائی کا انتقال ہوا تو وہ اس بات پر دکھی ہوتے تھے کہ میں تو ابھی تک آنحضرتؐ کی ہمراہی کا لطف اٹھا رہا ہوں اور میرا بھائی اب اس سعادت سے دُور ہے۔ اسی طرح ہمارے درمیان جو تعلق ہے وہ ترکی اور عربی ہونے کا نہیں ہے، اور نہ وہ قدیم شجرۂ نسب کی زنجیر میں ہے، بلکہ ہمارے دل تو آنحضرتؐ سے جڑے ہوئے ہیں اور ہم آپس میں ان ہی کی نسبت سے بندھے ہیں۔

یہ کہنے کا کہ ''کوئی اس کا ہم سر نہیں''، مطلب یہ ہے کہ دنیا میں بحیثیت قوم کے، کوئی ہماری برابری نہیں کر سکتا۔ اے ملتِ اسلامیہ، تیرے وجود کی مثال ایسی ہے جیسے ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھلا لالہ کا پھول جس نے کبھی پھول توڑنے والے کا دامن نہیں دیکھا جس میں وہ پھول توڑ کر جمع کرتا ہے۔ صبح کی پہلی ہوا نے اس کے سینے میں شعلہ بھڑکا دیا؛ آسمان اسے ایک ایسا ستارہ سمجھا جو دوسروں سے الگ ہو گیا، اور اسے اپنی آغوش سے جدا نہ کیا؛ سورج کی پہلی شعاع نے اس کے لبوں پر بوسہ دیا، اور شبنم نے اس کی آنکھوں سے نیند دھو ڈالی۔

عرضِ حال

یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کائنات آپؐ کے چہرے کے نور سے روشن ہے۔ جب میں نے آپؐ کا روئے اقدس دیکھا، آپ مجھے ماں باپ سے زیادہ محبوب ہو گئے۔ بانسری کی طرح ایک فریاد ہی میری کل پونجی ہے، یہی میرے ویران گھر کا چراغ ہے۔ چھپے ہوئے غم کو چھپائے رکھنا مشکل ہے، یہ ممکن نہیں کہ شیشے کی صراحی میں بھری ہوئی شراب نظر نہ آئے۔ مسلمان اپنے نبیؐ کی معرفت سے بیگانہ ہو گیا ہے۔ یہ کعبہ پھر سے بت خانہ بن گیا ہے۔ ہمارا شیخ، برہمن سے زیادہ کافر ہے کیونکہ اس نے ایک سو منات اپنے سر میں چھپا رکھا ہے۔ وہ کافروں ہی کی طرح موت سے ڈرتا ہے اور اُس کا سینہ دلِ زندہ سے خالی ہے۔ میں نے اُسے آبِ حیات کا پتا بتایا، اس کو قرآن کے کچھ حقائق و معارف سنائے، مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ میرے بارے میں کہتا ہے کہ تو قوم پر یورپ کا جادو چلا رہا ہے، تیرا سارا شور و غوغا فرنگی ساز سے برآمد ہوا ہے۔

آپؐ نے امام بوصیری کو چادر عطا فرمائی ہے اور مجھے یہ رباب عنایت کیا ہے۔ اس غلط سوچنے والے مفتی کو بھی حق کا ذوق بخش دیجیے، یہ اپنے ہی سرمائے کو نہیں پہچانتا۔ آپؐ کا نور سب زمانوں کی صحِ روشن ہے، آپ کی آنکھ سینوں کے اندر تک دیکھ لیتی ہے۔ اگر میرا دل اندھا آئینہ ہے اور میرے کلام میں قرآن کے سوا کوئی بات پوشیدہ ہے تو میری فکر کو سارے جہاں میں ذلیل کر دیجیے اور اس باغ کو میرے کانٹے سے پاک کر دیجیے۔ میرے جسم پر زندگی کی قبا تنگ کر دیجیے اور مسلمانوں کو میرے شر سے محفوظ فرما دیجیے۔ میری بنجر کھیتی کو سبز نہ ہونے دیجیے اور مجھے بہار کے بادل سے بے نصیب رکھیے۔ میرے انگوروں میں شراب کو خشک کر دیجیے اور میری کافوری مے میں زہر اُنڈیل دیجیے۔ یارسول اللہؐ! بس اِتنا ہی نہیں بلکہ قیامت کے دن بھی مجھے ذلیل و رُسوا کر کے اپنی قدم بوسی سے محروم رکھیں۔

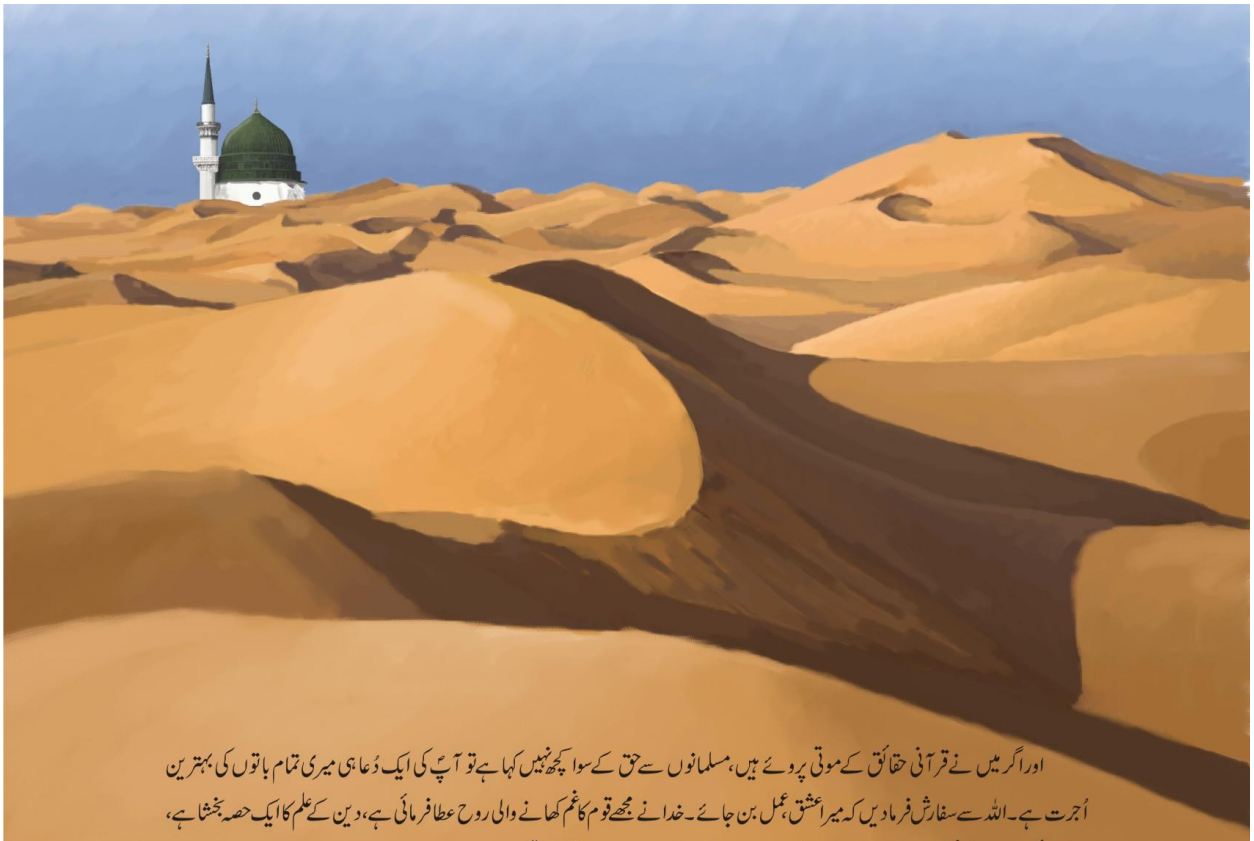

اور اگر میں نے قرآنی حقائق کے موتی پروئے ہیں، مسلمانوں سے حق کے سوا کچھ نہیں کہا ہے تو آپؐ کی ایک دُعا ہی میری تمام باتوں کی بہترین اُجرت ہے۔ اللہ سے سفارش فرمادیں کہ میرا عشق، عمل بن جائے۔ خدا نے مجھے قوم کا غم کھانے والی روح عطا فرمائی ہے، دین کے علم کا ایک حصہ بخشا ہے، دُعا فرمائیں کہ وہ مجھے عمل میں خوب ثابت قدم کردے۔ میں آبِ نیساں ہوں وہ مجھے موتی بنادے۔

جب سے اِس دنیا میں آیا ہوں، ایک اور ہی آرزو کی پرورش کررہا ہوں۔ جس دن اپنے والد سے آپؐ کا نام سیکھا، اس آرزو کی آگ کو بھڑکاتا ہی جارہا ہوں۔ یہ تمنا میری مٹی میں دبا ہوا گوہر ہے، میری رات میں ایک ستارے کی روشنی ہے۔

بجلیاں میرے خرمن کے گرد رقص کررہی تھیں اور رہزنوں کا لشکر میرے دل کا اثاثہ لوٹے لیے جارہا تھا، اُس وقت بھی یہ شراب میری روح کے پیالے سے نہ گری اور یہ خالص سونا میرے دامن ہی میں رہا۔ میں سالہا سال تشکیک میں گرفتار رہا اور فلسفے کی بے یقین دنیا میں پڑا رہا۔ میری تاریکی حق کے نور سے بیگانہ رہی اور میری شام کو شفق کا اُجالا میسر نہ آیا۔ یہ آرزو دل میں تھی تو مگر سوئی ہوئی، موتی کی طرح صدف میں پوشیدہ۔

آخر یہ تمنا میری آنکھ کے پیمانے سے چھلک پڑی اور اس نے میرے باطن میں بے شمار نغمے ایجاد کردیے۔ اور اب تو یارسول اللہؐ! میری روح آپؐ کے غیر کے خیال سے خالی ہوچکی ہے، اب اگر اجازت ہو تو اِس آرزو کو لب پر لے آؤں! میری زندگی عمل سے خالی تھی، اس لیے میں اس تمنا کے لائق نہ تھا۔ مجھے اس وقت بھی اس کے اظہار سے شرم آرہی ہے لیکن آپؐ کی شفقت میرا حوصلہ بڑھاتی ہے۔ ساری دنیا آپؐ کے سایۂ رحمت میں ہے، میری آرزو ہے کہ مجھے حجاز[1] میں مرنا نصیب ہو۔ اگر میری مٹی آپؐ کے در سے اُٹھے تو آہ میرا حال اور واہ میرا مستقبل!

میرے ستارۂ تقدیر کو دیدۂ بیدار بخش دیجیے۔ مجھے اپنی دیوار کے سائے میں لیٹنے کی جگہ دے دیجیے تاکہ اس بے قرار دل کو چین آجائے، یہ پارہ ایک جگہ جم کر ٹھہر جائے۔ پھر میں آسمان سے کہوں گا، ''میرا آرام دیکھو۔ تم نے میرا آغاز دیکھا، میرا انجام بھی دیکھ لو!''

۱۔ عرب کا وہ حصہ جہاں آنحضورؐ نے زندگی بسر فرمائی۔ مکہ اور مدینہ اسی علاقے میں ہے۔

سلسلۂ آسان کتب

مدیرِ عمومی: محمد سہیل عمر

اس سلسلۂ کتب کے تحت علامہ اقبال کی تمام تصانیف کو عام قاری کے لیے سلیس سادہ اور مختصر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

نثر:

تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ
خطبہ الٰہ آباد اور دوسری نثری تحریریں
علم الاقتصاد
ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقاء

خطوط:

حیاتِ اقبال: خطوط کے آئینے میں

شاعری:

اسرار و رموز
پیامِ مشرق
بانگِ درا
زبورِ عجم
جاوید نامہ
پس چہ باید کرد اے مسافر
بالِ جبریل
ضربِ کلیم
ارمغانِ حجاز

اسرار و رموز

نثری ترجمہ: مزملہ شفیق نگرانی: خرم علی شفیق

اقبال نے خواب میں دیکھا کہ مولانا جلال الدین رومی جو فارسی کے بہت بڑے شاعر، مفکر اور عظیم صوفی بزرگ ہو گزرے ہیں، خواب میں اُن سے کہہ رہے ہیں کہ مثنوی لکھیں۔ اگلی صبح بیدار ہوئے تو اُن کی زبان پر اُردو کی بجائے فارسی اشعار جاری تھے اور یہ ایک نئی مثنوی تھی۔ اُن کے دوست خواجہ حسن نظامی نے، جو کچھ عرصہ پہلے انہیں ''ترجمانِ حقیقت'' کا لقب دے چکے تھے، اِس نئی نظم کا نام 'اسرارِ خودی' تجویز کیا۔ یہ ۱۹۱۵ء میں شایع ہوئی اور تین برس بعد اقبال نے مثنوی کا دُوسرا حصہ 'رموزِ بیخودی' کے عنوان سے شایع کروایا۔ بعد میں یہ دونوں حصے یکجا اسرار و رموز کے نام سے شایع ہوئے۔ یہی اقبال کی شاعری کی پہلی کتاب ہے کیونکہ اِس سے پہلے جو اُردو نظمیں انہوں نے لکھی تھیں وہ اُس وقت تک کتابی صورت میں شائع نہیں کروائی تھیں اور اُنہیں بعد میں یکجا کیا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ہمیں اقبال کو سمجھنا شروع کرنا ہوگا تاکہ اُس روشن مستقبل کو سمجھ سکیں جس کا خواب اقبال نے ہمارے لیے دیکھا تھا۔